عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

مئی ۱۹۳۸

ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوع اسلام کراچی

(دورِ ثانی)

مرتب
محمد یونس

بدل اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

جلد ۱ شمارہ ۵

فہرست

محشرستان گودھرا	۱	طلوع اسلام پر ایک نظر	۵۲
جب ہماری حکومت آئیگی تو......	۲	اقبال اکادیمی	۶۳
ذرا سوچیے!	۳	مسلم لیگ کی تنظیم نو	۶۵
پاکستانی سکے؟	۴	لیگ کو ختم کر دیا جائے	۸۲
ملاح کی اصلاح	۵	آزاد پاکستان میں یوم اقبال	۹۷
۱۰ اپریل	۶	صنم خانۂ پندار (جناب اسد ملتانی)	۱۰۷
لمعات	۹	استفسارات	۱۰۸
قرآنی تعلیم (علامہ اسلم جیراجپوری)	۲۳	اسراف (ایک خط)	۱۱۱
می تواں کردن (جناب عشرت)	۴۰	جناح کیمپ؟	۱۱۲
سلیم کے نام.... (جناب پرویز صاحب)	۴۱	معاملہ کی ضروری باتیں	ٹائیٹل ۳

محشرستانِ گودھرا

ہندوستان کے اعمالِ سیاہ میں بہار، مشرقی پنجاب، دہلی اور مغربی یوپی کے بعد گودھرا کا اضافہ ہوا ہے احاطۂ بمبئی کا یہ بدقسمت شہر جس میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء تک تیس ہزار کلمہ گو بستے تھے، آج اذان کی آواز کو بھی ترس رہا ہے۔ حکومتِ بمبئی کے سرکاری اعلان کے مطابق سندھ سے گئے ہوئے غیر مسلم پناہ گزینوں نے ایک جلوس نکالا، ہلالی پرچم کو اتار کر پھاڑ ڈالا اور ایک مسجد کی بےحرمتی کی۔ اس کے ساتھ ہی مسلح ہندوؤں نے مقامی سول حکام اور فوج کی موجودگی میں اور ان کی عملی امداد سے شہر کو گھیر لیا اور بے بس اور نہتے مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کی جائدادوں کو لوٹنا اور ان کے مکانات کو نذرِ آتش کرنا شروع کر دیا۔ ضلع کے کلکٹر نے مسلم کشی کی اس مہم میں نمایاں حصہ لیا جن مسلمانوں نے اپنے عزیزوں کی جانیں بچانے کی کوشش کی انہیں گولی مار دی گئی۔ ہزاروں مسلمانوں کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک کر بھون ڈالا گیا۔

۳۰ مارچ کو احمد آباد سٹی کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر ارجن لال اور دوسرے کانگرسی کارکنوں نے گودھرا سے واپسی پر بتایا کہ گودھرا شہر عملی طور پر خاکستر ہو چکا ہے۔ آگ کے شعلے چودہ چودہ میل سے نظر آ رہے تھے۔ اسی تاریخ کو احمد آباد کے ایک گجراتی روزنامہ سندیش نے ایک اطلاع شائع کی کہ فساد سرحدی علاقوں، ملحقہ ریاستوں اور نواحی دیہات تک پھیل چکا ہے

۳۱ مارچ کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے نمائندہ نے گودھرا کا دورہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ اس وقت تک پچیس ہزار پریشان روزگار مہاجر باہر جا چکے ہیں۔ گودھرا میں ساڑھے تین ہزار مکانات جل چکے ہیں۔ ایک مرہٹہ سپاہی نے، جو گذشتہ جنگِ عظیم میں اٹلی میں ہلاکت آفرینی و تباہ کاری کے مناظر دیکھ چکا تھا، اس نمائندہ سے کہا۔

"میں نے اس قسم کی تباہ کاری دشمن کے بمباروں سے بھی نہیں دیکھی"

گودھرا میں یہ قیامت برپا تھی اور حکومتِ پاکستان خاموش تھی۔ بارے ۱۰ اپریل کو، یعنی پورے پندرہ روز کے انتظار کے بعد، نئی دہلی سے یہ خبر آئی کہ پاکستان کے نئے ہائی کمشنر ۱۱ اپریل کو بذریعہ ہوائی جہاز گودھرا جائیں گے۔

اپریل ختم ہو رہا ہے۔ بلارسیدگان گودھرا پاکستانی ہائی کمشنر کی کارگذاری کی تفصیل سننے کا بیتابانہ انتظار کر رہے ہیں۔ تازہ خبروں کے مطابق وہاں پھر گڑبڑ ہو رہی ہے۔ یہ سطور پریس میں بھیجنے تک حکومتِ پاکستان بدستور خاموش ہے۔

جب ہماری حکومت آئیگی تو.....

رات کا سناٹا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ گھوڑا قدم قدم چل رہا تھا۔ گاڑی بان بھی اونگھ رہا تھا۔ میں نے فضا کے سکوت کو توڑتے ہوئے یونہی گاڑی بان سے کہا۔

کہو میاں! اب تو تمہاری حالت بہتر ہو گئی ہوگی!

گاڑی بان چونکا اور عجیب سی بے رخی سے بولا — بابو صاحب! محض تم لوگوں کے یہاں آجانے سے ہماری حالت میں کیا فرق پڑے گا۔ پہلے بھی یہی مزدوری کرتے تھے جو اب ہے۔ سنا تھا کہ اب عنقریب مسلمانوں کی اپنی حکومت آجائیگی اس وقت البتہ ہماری حالت میں بھی فرق آجائے گا۔ لیکن معلوم نہیں وہ حکومت کب تک آئیگی۔ چھ مہینہ سے ایسا ہی سنتے آرہے ہیں۔

میں نے کہا۔ میاں! وہ حکومت تو چھ مہینے سے آچکی ہے۔ تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔

اس نے حیرت سے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہا۔ کیا کہا بابو جی آپ نے؟ چھ مہینے سے ہماری حکومت آچکی ہے؟ یہاں تو وہی لائسنس کلرک ہے۔ وہی اس کی جھڑکیاں اور وہی اس کے تقاضے۔ وہی پولیس ہے اور وہی ان کی بیگار اور وہی گالیاں۔ وہی تیل کی مصیبت۔ وہی دانے اور گھاس کی دقت۔ ہماری اپنی حکومت ہوتی تو ہماری یہ حالت کیسے رہتی؟

میں اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اور اس کا جواب دے بھی کون سکتا تھا!

اے وہ کہ جن کی زبانوں پر ہزار مرتبہ لفظ جمہوریت آنے کے باوجود ان کا دل ایک بار بھی اس کی گواہی نہیں دے سکا۔ اپنے دل کے کانوں سے سن رکھیں کہ یہ لفظ کبھی شرمندۂ معنیٰ نہ ہوگا جب تک ایک گاڑی بان تک بھی یہ محسوس نہ کرنے لگے کہ اس کی حالت میں فی الواقعہ فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اور یاد رکھئے! یہ تبدیلیٔ احوال نہ اس وثیقہ سے ہوگی جو انگریز کی طرف سے پاکستان کیلئے تمہیں مل گیا ہے۔ اور نہ اُن قوانین و ضوابط سے جو تم مشین کی طرح نافذ کرنا چاہتے ہو۔

بلکہ یہ تبدیلی اُس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک تمہارے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ ہو جائے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

(یقیناً خدا کبھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنے اندر نفسیاتی انقلاب پیدا نہ کرے)

کا یہی مفہوم ہے۔

ذرا سوچئے!

کسی بڑے سے بڑے آدمی سے کہئیے کہ اس کا جوتا ٹوٹ گیا ہے، چار ٹانکے لگا دے۔ وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ جوتا موچی کے پاس لے جائیے۔

کسی قابل سے قابل آدمی سے کہئیے کہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے، وہ کہے گا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔

کسی لائق سے لائق انسان سے پوچھئیے کہ تقسیم جائداد کا جھگڑا ہے میں کیا کروں۔ وہ کہہ دیگا کہ کسی قانون دان وکیل کے پاس جاؤ۔

غرضیکہ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جس کے متعلق کوئی یہ نہ کہہ دے کہ میں اس کا اہل نہیں لیکن حکومت کی کرسی کسی شخص کو پیش کر دیجئیے کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں اس کا اہل نہیں۔ اس کیلئے کسی ایسے شخص کی تلاش کیجئے جو اس کی قابلیت رکھتا ہو۔

یعنی دنیا میں جوتا گانٹھنے تک کے لئے کسی قابلیت کی ضرورت ہے، لیکن حکومت کے لئے نہ کسی اہلیت کی ضرورت ہے نہ قابلیت کی۔ نہ استعداد کی شرط ہے نہ موزونیت کی۔ یہ وہ کرسی ہے جس پر بیٹھنے کیلئے ہر شخص تیار ہے۔ اور تیار ہی نہیں بلکہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد سمجھتا یہ ہے کہ اس سے زیادہ اس کے لئے کوئی اور موزوں ہی نہیں۔

حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام حکومت ہے۔ کسی انسان کا، دوسرے انسانوں کے معاملات میں حکم ہونا اور ان کے اختیار و ارادہ پر پابندیاں عائد کرنا۔ یہ تو چھوٹے درجے کی خدائی ہے۔ لیکن موچی بننے کے لئے تو کسی استعداد کی شرط ہے۔ اس "خدائی" کے فرائض سرانجام دینے کے لئے کوئی شرط نہیں۔

پاکستانی مٹکے

بچپن میں ایک داستانِ قصہ سنا کرتے تھے کہ جب حضرت نوحؑ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر کشتی میں سوار ہو گئے اور کفار سے کہدیا کہ آج اس طوفانِ بے پناہ سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی تو انہوں نے دیکھا کہ کفار نے بڑے بڑے مٹکے لئے اور انہیں پانی میں پھینک کر ان پر تیرنا شروع کر دیا۔ اس سے حضرت نوحؑ کو سخت قلق ہوا اور انہوں نے بدرگاہ رب العزت دعا مانگی۔ اس پر اللہ میاں نے سخت تیز آندھی چلادی جس سے وہ مٹکے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔ اور ان کے سہارے تیرنے والے، سیلاب میں غرق ہو گئے۔

یہی نظارہ ہمیں سندھ اور پنجاب میں دکھائی دے رہا ہے۔ ایک طرف پنجاب کے وزراء اور اکابرین حضرات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ دوسری طرف سندھ میں وزیر اعظم اور دیگر وزراء کے مٹکے ایک دوسرے سے ٹکریں لے رہے ہیں اور سیلاب بلا کی طغیانیاں ان پہ ہنس رہی ہیں کہ اس قسم کے سہارے پکڑنے والوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ اور دور سے ایک آواز پکار کر کہہ رہی ہے کہ

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ
اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (۶/۶۵)

اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر آسمان سے عذاب نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم پارٹی بازی میں الجھ جاؤ اور اس طرح تم ایک دوسرے سے ٹکرانے کا مزہ چکھ لو۔

ملاح کی اصلاح!

ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کشتی میں چھید کیوں کرتے ہو؟

کشتی میں چھید کیوں کرتا ہوں؟ پچاس دفعہ اس ملاح سے کہہ چکا ہوں کہ تم نے بادبان غلط باندھا ہے۔ کشتی، سمتِ ساحل نہیں جا رہی، اس کا رخ سیدھا کرو۔ لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ اب جو کشتی بیکار ہو گی تو پتہ چلے گا۔!

ارے پاگل! کشتی میں چھید کرو گے تو کشتی کے ساتھ خود بھی ڈوبو گے۔ ملاح کو تنبیہ کا یہ کونسا طریق ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ناخدائی جانتا ہے تو ملاح کے ہاتھ سے چپو چھین لو اور کشتی کا رخ سیدھا کر دو۔ لیکن کشتی کو سلامت رکھو کہ اس کی سلامتی میں خود تمہاری سلامتی ہے

پاکستان کے موجودہ ارکانِ حکومت و اقتدار کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو خود مملکت پاکستان کی کمزوری کا باعث بن جائے کہ اس کشتی کے (خدانخواستہ) ڈوبنے سے ہم سب غرقِ قعرِ مذلت ہو جائیں گے۔ ملاح غلط کار ہے تو اس کے ہاتھ سے چپو لے کر بہترین ہاتھوں میں دیدیجیئے۔ لیکن کشتی میں چھید نہ کرنے بیٹھ جایئے کہ دشمن ہر وقت گھات میں ہے۔

۲۱ اپریل

ہم نے مارچ کے طلوعِ اسلام میں حکومتِ پاکستان کی توجہ اس اہم فروگذاشت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ ۱۹۴۸ء کی تعطیلات کی فہرست میں یومِ اقبالؒ (۲۱ اپریل) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اپریل کے شمارہ میں دوبارہ یاددہانی کرائی گئی۔ اس پر حکومتِ پاکستان کی وزارت داخلہ نے طلوعِ اسلام کے نام ایک مکتوب میں جو عذر پیش کیا ہے اور اس کا جو جواب طلوعِ اسلام نے دیا ہے، وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ دونوں مکتوبات قوم کے سپرد ہیں۔ اب وہی اس پر تبصرہ کر سکتی ہے، ہماری طرف سے مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

مکتوب از اسسٹنٹ سکرٹری حکومت پاکستان

"مجھے یہ کہنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی مرکزی حکومت کے دفاتر میں تعطیلات کی فہرست پورے غور و خوض کے بعد، کابینہ کی منظوری سے، شائع کی گئی تھی۔ اس فہرست میں مزید اضافہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کے یومِ وفات پر ۲۱ اپریل کو تعطیلِ عام کا اعلان کرنا بہت بعد از وقت ہے۔ ہاں اس بات کو نوٹ کر لیا گیا ہے اور جب ۱۹۴۹ء کے لئے تعطیلات کا عام مسئلہ زیرِ غور آئیگا، اس پر مناسب غور کیا جائے گا۔"

مرتب کرتے وقت یہ دیکھئے کہ اس میں اس قدر اہم تقریب کی فروگذاشت نہ ہو جائے۔ اس فروگذاشت کی طرف ہم نے اوائل مارچ میں آپ کی توجہ منعطف کرائی۔ پھر طلوعِ اسلام کی اپریل کی اشاعت میں دوبارہ یاددہانی کرائی گئی۔ اس کے باوجود عذر یہ پیش کیا گیا ہے کہ اب بہت دیر ہو گئی ہے اس لئے ۲۱ اپریل کی تعطیل نہیں منائی جا سکتی۔ حالانکہ آپ کی اس چٹھی کی تاریخ اور یومِ اقبال میں قریب ایک ہفتہ کا فصل باقی ہے۔ قوم ابھی اس چیز کو بھی نہیں بھولی کہ ابھی کل کی بات ہے، ہندوؤں کے قومی رہنما مسٹر گاندھی کے قتل کی خبر دفاتر بند ہونے کے بعد پہنچی تھی اور دوسرے دن حکومتِ پاکستان کے دفاتر میں تعطیل تھی اور اس تعطیل کا اعلان رات کے نو بجے ریڈیو پر ہو گیا تھا۔ وہ فیصلہ تین گھنٹے میں ہو گیا تھا لیکن پاکستان کے تصور کے بانی، ملتِ اسلامیہ کے محسنِ اعظم، قوم کی نشاۃِ ثانیہ کے ذمہ دار کے یومِ وفات کی تعطیل کا فیصلہ آٹھ مہینے میں بھی نہیں ہو سکا۔

آپ کا زیرِ نظر مراسلہ ۱۶ تاریخ کو لکھا گیا ہے۔ گاندھی کی چھٹی کا فیصلہ کرنے میں جتنے گھنٹے لگے تھے اس تاریخ سے یومِ اقبال تک اس سے دوگنے دن باقی تھے۔ حکومت چاہتی تو اس عرصہ میں مناسب فیصلہ کر سکتی تھی۔ بہرحال اقبال لاثانی شہرت کا مالک ہے۔ اس کی یاد ان ذرائع کی محتاج نہیں۔ اس سے فقط احسان شناسی کے جذبہ کا اظہار مقصود تھا۔ دنیائے تشکر و امتنان میں حکومتِ پاکستان کی یہ احسان فراموشی کس نگاہ سے دیکھی جائے گی اس کا فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی۔ اگر ہندو یا انگریزی حکومت میں یہ فیصلہ ہوتا تو ہم مسلمانوں کے سامنے اس کا گلہ کرتے۔ اب تو ہمیں یہی حیرت ہے کہ اس کا گلہ کس سے کریں۔"

اس چٹھی کے بعد ہمیں مایوسی کا اطمینان ہو گیا تھا کہ ۲۰ اپریل کی شام کو اچانک ہمارے ایک دوست آئے جن کی تنقید [illegible] کی طرح تند و تیز ہوا کرتی ہے۔ گھبرائے ہوئے سے کہنے لگے: "تمہیں کچھ معلوم ہوا۔ حکومتِ پاکستان کے محکمہ امورِ داخلہ میں ابھی ابھی لاہور سے ٹیلی فون آیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چنانچہ اربابِ حکومت نے اس خبر کے سنتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ کل دفاتر بند رہیں گے۔" اس کے بعد وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ بعد ازاں ہمیں ہماری چٹھی مورخہ ۱۹ کے جواب میں ذیل کا خط موصول ہوا۔

نمبر ۱۵/۴۸ پبلک۔ محکمہ امور داخلہ۔ مورخہ ۲۰؍اپریل ۱۹۴۸ء

آپ کی چٹھی نمبری ۹۲/۴۸ مورخہ ۹/۴/۱۹۴۸ کے جواب میں تحریر ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، ۲۱؍اپریل ۱۹۴۸ء علامہ اقبالؒ کی پہلی برسی کا دن ہوگا۔ حکومت مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد میں اس دن تمام دفاتر بند رہیں گے۔

ہم حکومت پاکستان کے محکمہ امور داخلہ کے ارباب بست وکشاد کے نہایت شکر گذار ہیں کہ انہوں نے یہ بتا کر کہ حصول پاکستان کے بعد، ۲۱؍اپریل ۱۹۴۸ء علامہ اقبالؒ کا پہلا یوم وفات ہے، ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ فرمایا ہے۔ حکومت بہرحال حکومت ہے۔ اس کے ذرائع خبر رسانی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ دنیا نے ہزار کوشش کی کہ یہ راز کسی پر فاش نہ ہونے پائے کہ ۲۱؍اپریل ۱۹۴۸ء، آزاد پاکستان میں علامہ اقبالؒ کی برسی کا پہلا دن ہے۔ لیکن حکومت کے سراغ رسانوں نے اس کا پتہ لگا ہی لیا۔

بڑی مشکل سے ہوتے ہیں چمن میں دیدہ ور پیدا۔

کہتے ہیں کہ کوئی عرب، محرم کے مہینے لکھنؤ آنکلا۔ لوگوں کو ماتم کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا بات ہے کسی نے بتایا کہ یہ لوگ حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر ماتم کر رہے ہیں۔ حیرت سے کہنے لگا کہ۔ اچھا! یہاں اب خبر پہنچی ہے۔

۲۰؍اپریل کی چٹھی بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ حکومت پاکستان کے محکمہ امور داخلہ میں حضرت علامہؒ کی وفات کی خبر کامل دس برس کے بعد پہنچی۔

یہ ہے ہماری مرکزی حکومت کے ارباب حل وعقد کا حال۔ ہمیں یقین ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں بھی کوتاہیٔ فکر ونظر اور بدسلیقگی کا اس سے بدتر نمونہ کبھی نہ پیش ہوا ہوگا۔ ۱۷؍اپریل کی چٹھی دیکھیے اور اس کے بعد اسی محکمہ اور انہی صاحب کے دستخطوں سے ۲۰؍اپریل کی۔ اور پھر روئیے اس قوم کی قسمت پہ جس کے کارپردازان اس قسم کے واقع ہوئے ہوں۔

لمعات

"پاکستان کا نظامِ حکومت شریعتِ اسلامی کے مطابق ہونا چاہیئے"

یہ ہے وہ آواز جو تحریکِ حصولِ پاکستان کے زمانہ میں بھی بلند ہو کر ہر قلب حساس کیلئے وجہِ نشاط روح ہوتی رہی اور اب تشکیلِ پاکستان کے بعد ہر در و دیوار سے اٹھ کر باعثِ طمانیت جان ہو رہی ہے۔ حصولِ پاکستان کی تحریک سے ہماری وابستگی و تائید اور اب تشکیلِ پاکستان کے بعد اس کے استحکام و استقرار کے لئے ہماری دعائیں اور تمنائیں، محض اس لئے ہیں کہ ہمیں اس سے اسلامی نظامِ معاشرت و حکومت کے قیام کے امکانات حاصل ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ چاروں طرف سے یہ آواز تو بلند ہو رہی ہے مگر کہیں سے یہ سننے میں نہیں آتا کہ وہ اسلامی نظام جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ بالآخر ہو گا کیا؟ قوم مطالبہ پر مطالبہ کئے جا رہی ہے کہ پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ ہونا چاہیئے اور حکومت کے نمائندے وعدہ پر وعدہ کئے جا رہے ہیں کہ تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ بالآخر وجہِ اضطراب کیا ہے؟

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں!

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ ان کی طرف سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہم کیا مانگ رہے ہیں۔ اور نہ ان کی طرف سے اس کی صراحت کہ اس وعدہ کی تجسیمی صورت کیا ہو گی۔ بس! آوازیں ہیں کہ اُدھر سے بھی اٹھ رہی ہیں اور اِدھر سے بھی۔ آیئے! ذرا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ

مطالبہ کرنے والوں کے ذہن میں عام طور پر کیا کچھ ہے اور وعدہ کرنے والے اسے کیا سمجھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے؟

جہاں تک مطالبہ کرنے والوں کا تعلق ہے، ان میں سے عوام بچاروں کو تو نہ کبھی پتہ ہوا ہے اور نہ اب ہے کہ ہم سے کیا کہلوایا جا رہا ہے۔ ان کے ذہن میں نظام شریعت سے مفہوم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عید، بقرعید، معراج، شب برات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ارباب حکومت ڈاڑھیاں بڑھالیں، لمبی ترشوالیں، نمازیں پڑھنا شروع کر دیں اور "اسلامی تہواروں" پر جشن کا انتظام کر دیا کریں تو ان کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ ان سے آگے بڑھئے تو ارباب شریعت کا طبقہ آتا ہے۔ یہاں ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اہل تشیع میں سے ہیں تو ان کے نزدیک اسلامی شریعت حقہ کچھ اور ہوگی۔ پھر سنی حضرات میں سے، اہل حدیث کے نزدیک شریعت نام ہوگی ان تمام جزئیات و تفاصیل کے مجموعہ کا جو کتب روایات میں مذکور ہیں۔ اور اگر وہ اہل فقہ ہیں تو شریعت نام ہوگا ان تمام فتاویٰ کا جو ائمہ فقہ نے اپنے اجتہادات سے وقتاً فوقتاً صادر فرمائے۔ اور ان سب کے باہمی اختلافات (بلکہ مخالفت) کا یہ عالم ہے کہ ایک کے نزدیک، دوسرے کی شریعت، اسلامی نہیں اور دوسرے کے نزدیک تیسرے کا نظام شرعی نہیں۔ ہزار برس سے ان میں باہمی تضاد و تخالف چلا آ رہا ہے، جو رفتہ رفتہ مستقل مذاہب کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس اختلاف کی بنا پر باہمی معاندت و مخاصمت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھ تک نہیں سکتا۔

یہ ہے پاکستان میں نظام شرعی کی تنفیذ کا مطالبہ کرنے والوں کی حالت۔

اب دوسری طرف وعدہ کرنے والوں کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک مذہب "قدامت پرستی" کی دلیل اور "تاریک خیالی" کا مظاہرہ ہے۔ اس لئے اس روشن خیالی کے دور میں کسی حکومت میں مذہبی نظام کی ترویج ازمنۂ مظلمہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اس لئے وہ سرے سے اس مطالبہ ہی کو دقیانوسیت اور ملائیت کی تنگ نظری پر مبنی قرار دیتے ہیں جو ترقی کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہے۔ لیکن وہ اپنے ان خیالات کو برملا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں خطرہ ہے کہ اس سے عوام میں بدنام ہو جائیں گے اور شاید ان مصالح و مدارج سے محروم، جن پر وہ آج کسی نہ کسی طرح قابض ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں صرف اتنا تصور ہی کپکپی پیدا کر دینے کیلئے کافی ہے کہ اگر شرعی نظام نافذ ہو گیا تو اس میں نماز پڑھنی پڑیگی۔ انہیں نماز روزہ کا خطرہ چھلاوہ بن کر ڈرا رہا ہے اور یہ سوچ کر ان کی روح فنا ہو جاتی ہے کہ اگر شریعت کا قانون جاری ہو گیا تو کیا کریں گے؟

کچھ وہ ہیں جو قوانین شرعیہ کا احترام تو کرتے ہیں لیکن وہ خائف ہیں کہ مولوی صاحبان کی وہ شریعت جو ہزار برس پہلے کے ماحول اور اس زمانہ کے مقتضیات کو پورا کرنے کیلئے وضع کی گئی تھی، ہمارے زمانہ کے تقاضوں کو کس طرح پورا کرے گی! اس خطرہ سے وہ خود گو مگو میں ہیں۔

انکاری کنیم و نہ ایں کاری کنیم

نہ نظام شرعیہ کے نفاذ کے مطالبہ کی تردید کر سکتے ہیں نہ اسے نافذ کرنے کی ہمت اپنے اندر پاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اسے آج کی ضروریات کے پیش نظر ناممکن العمل پاتے ہیں۔ نہ صرف ناممکن العمل بلکہ جب وہ مولوی صاحبان سے سنتے ہیں کہ "شریعت" کی رو سے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا تو وہ اور بھی ڈرتے ہیں کہ اس قسم کے قانون کو ہم آج کی مہذب دنیا میں کس طرح چلا سکیں گے! غرضیکہ ان دعویٰ کرنے والوں کو مطالبہ کرنے والوں سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا ہے۔ اور ان فریقین کے اندر اسلام بیچارا ششدر و حیران کھڑا ہے کہ جاؤں تو کدھر جاؤں اور کروں تو کیا کروں۔ کس طرح انہیں سمجھاؤں کہ مجھے نہ تم سمجھے ہو نہ تم۔

بات بالکل سیدھی سی ہے۔

اسلامی نظام کی اساس اس حقیقت کبریٰ پر ہے کہ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے۔

اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہتے ہیں کہ حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔

خدا نے اپنی اطاعت کے لئے ہمیں اپنا ضابطۂ قوانین عطا کر دیا ہے جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس لئے نظام حکومت خداوندی کا ضابطۂ آئین، قرآن کریم ہوگا۔

قرآن، خدا کی طرف سے نازل شدہ، آخری اور مکمل ضابطۂ قوانین ہے۔ اس لئے یہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے انسانوں کے لئے ضابطۂ اطاعت ہوگا۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانی فطرت کے تقاضے تو غیر متبدل ہیں لیکن ان تقاضوں کی تکمیل کے اسباب و ذرائع اور ان کی عملی تشکیل کی نوعیتیں زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔

اس لئے قرآن کریم نے (چند متعین احکامات کے علاوہ، کہ جن میں تغیر و تبدل مقصود نہ تھا) نظام اطاعت کی تشکیل کے لئے بڑے بڑے اصول (Broad principles.) بیان کر دیئے ہیں جن کے تابع، ہر زمانہ کے انسان اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق عملی جزئیات متعین کر سکتے ہیں۔ ان جزئیات کو آپ (Bye Laws) کہہ سکتے ہیں۔ ان جزئیات کی تشکیل، مختلف زمانہ کے ارباب حل و عقد کے ذمہ ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ فٹ بال کے میدان میں کچھ لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں۔ اور کچھ اصولی قاعدے مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ ان حدود کے اندر ٹیم کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ پوری سعی و کاوش سے گیند کو گول (منزل مقصود) تک لے جائیں۔ یہ اصولی لکیریں، نظام اطاعت اسلامی میں حدود اللہ کہلاتی ہیں۔ حدود اللہ کے اندر، ہر زمانہ کے انسانوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی اپنی ضروریات (مقتضیات) کے مطابق جزئیات متعین کر لیں۔ یہی جزئیات اسلامی نظام حکومت کا ضابطۂ قوانین بن جاتا ہے۔

بس یہ ہیں نظام حکومت اسلامیہ کے خط و خال جنہیں نہ معلوم کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے!

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے — بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے

اس نظامِ حکومت میں آپ دیکھیں گے کہ نہ تو وہ بے باکانہ سرکشی ہے کہ جس کی رو سے ایک انسان (یا انسانوں کی کوئی جماعت) جس قسم کے قوانین جی چاہے بنا کر دوسرے انسانوں سے ان کی اطاعت کرائے۔ اور نہ ہی ایسی جکڑ بندی کہ آج کے انسان کو ان جزئیات میں باندھ دیا جائے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے کے زمانہ کی ضروریات و مقتضیات کو پورا کرنے کے لئے وضع کی گئی تھیں اور جو آج کسی طرح بھی نافذ العمل نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا یہ وہ ضابطۂ قانون ہے

نہ جس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

اس ضابطۂ اطاعت کا مدار "حقائقِ ابدی" پر ہے جس پر زمانہ کے تغیرات کوئی اثر نہیں کر سکتے لیکن اس کی جزئیات، ہمیشہ رد و بدل کے قابل تاکہ وہ ہر زمانہ کے ماحول سے تطابق حاصل کر لیں۔ ان میں (Fit) ہو جائیں

پھر اس میں نہ شیعہ، سنی کا اختلاف ہوگا، نہ مقلد غیر مقلد کا جھگڑا۔ کہ اس کی اساس اس ضابطۂ خداوندی (قرآن کریم) پر ہوگی جس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس میں کہیں تضاد و تخالف نہیں

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ لوگ بہت سے اختلافات پاتے"۔

اور اس کی حدود ایسی واضح اور غیر مبہم ہیں کہ ان کی تعیین میں کہیں کوئی اشکال و ابہام نہیں۔ اس کا اپنا دعویٰ ہے کہ اس کی تعلیم مفصل، غیر مبہم اور روشن ہے۔ اختلاف، جزئیات میں آکر پڑتا ہے، اور چونکہ ہم نے، بدقسمتی سے، کسی ایک زمانہ میں متعین کردہ جزئیات کو بھی، قرآنی اصولوں کی طرح ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھ لیا ہے، اس لئے، جزئیات کا اختلاف

ایک مستقل حیثیت اختیار کر کے مختلف مذاہب (یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقے) بن چکا ہے۔ اور اس کے بعد فرقہ بندی کے تعصب کی بنا پر کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہر فرقہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میرے ہاں کے جزئیات ہی اصل دین ہیں اور بس۔ ہم صدیوں سے اسی پیچ میں الجھے ہوئے چلے آرہے ہیں اور خدا کی وہ زندہ اور روشن کتاب، جو ہر زمانہ میں ہمارے لئے مشعلِ ہدایت بنی تھی، مہجور و محجوب بن کے رہ گئی ہے۔ چنانچہ آج بھی جب پاکستان کیلئے اسلامی نظامِ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہر مطالبہ کرنے والے کے پیشِ نظر ان ہی جزئیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی زمانہ کے مقتضیات کو پورا کرنے کیلئے وضع کی گئی تھیں اور جنہیں انہوں نے محض تقلیداً مستقل اور غیر متبدل حیثیت دے رکھی ہے۔ مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ (جس کے لئے اللہ نے کوئی سند نہیں نازل کی)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ نہ تو اسلامی نظامِ شریعت کا مطالبہ کرنے والے کوئی ایسا نظام پیش کر سکتے ہیں جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو (یعنی جسے ہر ایک "شریعت" تسلیم کر لے)، اور نہ ہی وہ خطرہ بے بنیاد ہے جو وعدہ کرنے والوں میں سے (کم از کم) ایک گروہ کو ہو اِنْ اکر دوار ہا ہے کہ معلوم کہ یہ کن نا لکن العمل قوانین کی تنفیذ کا مطالبہ کر دیں جسے ہم آج کی دنیا میں چلا ہی نہ سکیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا اصولی نظام بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ جس کے منصوص ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو اور جس کی روشنی میں ایسے قوانین وضع کئے جا سکیں جو ہمارے زمانہ کے مقتضیات و حوائج کو بطریقِ احسن پورا کر سکیں اور جس کی طرف ساری دنیا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھے۔

لیکن اس نظام کی اساس قرآنی ہوگی اور مسلمان شاید ابھی خرابیوں کے بعد بھی قرآن کے قریب آنے کے لئے تیار نہیں۔

جہانتک ہمیں علم ہے۔ اس وقت تک مطالبہ کرنے والوں کی طرف سے، کوئی متعین چیز کسی گوشہ سے بھی باہر نہیں آئی جسے یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہو کہ یہ ہے وہ اسلامی نظام شریعت جس کی تنفیذ کا ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ اس باب میں البتہ، حکومت پنجاب کے محکمۂ تشکیل جدید اسلامیات کے ڈائرکٹر، مسٹر اسد لیوپولڈ، کی ایک کوشش محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آئی ہے جسے انہوں نے اسلامی نظام کے خاکہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

اسد صاحب نے عرفات بابت مارچ ۱۹۴۸ء میں "اسلامی آئین سازی" کے عنوان سے (انگریزی میں) ایک مبسوط مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں وہ اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کے متعلق دین نے صرف بڑے بڑے اصول متعین کئے ہیں اور ان اصولوں کی جزئیات کو ہر زمانہ کے لوگوں کے تفقہ و اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے یہ جزئیات ابدی طور پر نافذ العمل نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا مختلف زمانہ کے ائمہ فقہ نے اپنے اجتہادات سے جو قوانین و ضوابط مرتب کئے تھے وہ ان ہی کے زمانہ کے لوگوں کے لئے قانون شریعت تھے۔ آنے والوں کے لئے نہیں۔ یہاں تک بات وہی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ دین کی نصوص، جو ابدی طور پر غیر متبدل رہیں گی اور جو ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے واجب العمل قرار پائیں گی، کتاب و سنت کے اندر ہیں۔ سنت سے اگر ان کی مراد روایات ہیں (اور ان کی یہی مراد ہے جیسا کہ وہ ذرا آگے چل کر خود ہی اس کی تصریح کر دیتے ہیں) تو حیرت ہے کہ یہ صاحب اس چیز کو خود اپنے ہی تسلیم کردہ اصول سے کس طرح مطابق پاتے ہیں۔ اصول ان کا یہ ہے کہ (۱) دین نے صرف اصول عطا کئے ہیں جزئیات متعین نہیں کیں اور (۲) اصول دین کے تابع جو جزئیات متعین ہوں گی وہ ایک خاص ماحول سے متعلق ہوں گی۔ روایات نے اس قدر جزئیات متعین کی ہوئی ہیں کہ وہ کسی صورت میں ائمہ فقہ کے جزئیات سے کم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل حدیث حضرات کے مذہب کی بنیاد ہی اس دعوے پر ہے کہ شریعت کے متعلق تمام جزئیات روایات میں موجود ہیں اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ائمہ فقہ، شریعت کی جزئیات اپنے اجتہاد

سے مرتب کرتے۔ اسد صاحب نے فقہار کی مرتب کردہ جزئیات کو قابل تغیر و تبدل اور قرآنی
کی جزئیات کو ناقابل تغیر قرار دے کر نہ صرف اپنے مسلمہ اصول کو ہی چھوڑ دیا ہے بلکہ اہل حدیث
اور اہل فقہ کی پرانی بحث کو چھیڑ کر ایک فرقہ کی طرفداری کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون کا بیشتر
حصہ اسی میں صرف کر دیا ہے کہ ائمہ فقہ کی مرتب کردہ جزئیات آنے والوں کے لئے شریعت کا حکم
نہیں رکھتیں۔

اس کے بعد انہوں نے اسلامی نظام کے کچھ خط و خال متعین کئے ہیں۔ ان میں سے ایک
یہ ہے کہ "دولت اسلامیہ کا امیر مسلمان ہوگا جسے ملت منتخب کرے گی اور اسے اس کا اعلان
کرنا ہوگا کہ وہ قانون اسلامی کے مطابق حکومت کریں" یہ بالکل درست ہے۔
اس کے بعد انہوں نے کہا ہے کہ اس امیر کی ایک مجلس شوریٰ ہوگی جو ملت کے منتخب کردہ
نمائندگان پر مشتمل ہوگی۔ یہ بھی درست ہے۔ البتہ انہوں نے جو لکھا ہے کہ اس مجلس شوریٰ
کے فیصلے کثرت رائے سے طے پائیں گے۔ جنہیں امیر کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس میں مزید فکر
کی گنجائش ہے۔ لیکن انہوں نے جو اس سے بھی بڑی چیز بیان کی ہے وہ آگے آتی ہے۔ وہ
لکھتے ہیں کہ اس حکومت (امیر معہ مجلس شوریٰ) کے فیصلوں کی اطاعت معروف میں ہے معصیت
میں نہیں۔ یہ لکھنے کے بعد وہ خود ہی اس سوال کو سامنے لاتے ہیں کہ اگر افراد ملت کو یہ حق
دیدیا جائے کہ وہ جس فیصلہ کو معروف سمجھیں اس کی اطاعت کر لیا کریں اور جسے معصیت سمجھیں
اس کی اطاعت سے انکار کر دیں تو اس سے ایک ایسی فوضویت (Anarchy) کا دروازہ
کھل جائے گا جس سے کوئی نظام حکومت قائم ہی نہیں رہ سکے گا۔ اس کا حل وہ یوں بتلاتے
ہیں کہ یہ حق افراد کو نہیں بلکہ ملت کو دیا جائے گا اور ملت استصواب عامہ سے فیصلہ کیا
کرے گی کہ کہاں تک اطاعت ضروری ہے اور کہاں سے معصیت شروع ہو جاتی ہے۔
اس جاسں پر ایک اور اشکال لاحق ہو گیا کہ اس استصواب کا انتظام کون کرے گا۔ یا شاید

اگر امیر اور اس کی مجلس شوریٰ میں اختلاف ہو جائے تو اسے کون رفع کرے گا۔

اس مشکل کا حل یہ بتلاتے ہیں کہ امیر اور مجلس شوریٰ کے اوپر ایک ایوانِ اعلیٰ (Supreme Conoil) ہو گی جس کے فیصلے ان تمام امور میں ناطق ہوں گے۔

یعنی بالفاظِ دیگر، تمام حکومت و اقتدار درحقیقت اس ایوانِ اعلیٰ کے ہاتھ میں ہو گی۔ اور اس کے فیصلوں کا امیر مانع نہیں ہو گا۔ یہ ملت کے منتخب کردہ امام کو بھی الگ کر سکے گی اور اس کی مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو بھی بدل سکے گی۔ ملت اور حکومت کی منازعت کی صورت میں، یہ حکم کا بھی کام دے گی۔ اور اس کے فیصلے آخری ہوا کریں گے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ مجلس اعلیٰ کن حضرات پر مشتمل ہو گی۔

علمائے کرام پر جو قرآن اور حدیث کا پورا پورا علم رکھتے ہوں گے اور امورِ دنیا سے بھی واقف ہوں گے:

ہم سمجھتے تھے کہ اسد صاحب مغرب نژاد ہیں۔ روشن دماغ ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ اور قرآن پر نگاہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ اس لئے وہ قرآنی اصولِ جمہوریت و مشاورت کو صحیح طور پر سمجھ چکے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر بحد افسوس ہوا کہ وہ اسلامی نظامِ حکومت کو، انتخاب، جمہوریت، مشاورت، وغیرہ کی وادیوں سے گزارتے ہوئے، خالص برہمنیت (Priest hood) کے غار میں لے گئے جہاں آج تک نہ عقلِ انسانی کا چراغ روشن ہوا ہے نہ نورِ یزدانی کی عالمتاب شعاعوں نے بار پایا ہے۔

اور اس کی دلیل لوہی آیت قرآنی جس کے غلط مفہوم نے بہت سے لوگوں کو قرآنی نظامِ حکومت کو صحیح طور پر سمجھنے سے روک رکھا ہے۔ وہ آیت جلیلہ ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

اور اس کے معنی کئے جاتے ہیں۔

اطاعت کرو اللہ کی۔ اس کے رسول کی۔ اور اپنے میں سے صاحبانِ حکومت کی۔ پھر اگر

کسی معاملہ میں تمہارا اور ارباب حکومت کا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف (فیصلہ کے لئے) لے جاؤ۔

اور اس کا مفہوم

(۱) اللہ کی اطاعت ـــــ بذریعہ قرآن

(۲) رسول کی اطاعت ـــــ بذریعہ روایات

(۳) اور اگر تم میں اور حکومت میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لئے قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کیا کرو۔

(۴) یعنی ان علماء کی طرف جو قرآن و حدیث جانتے ہوں۔

یعنی حکومت الگ ہے۔ علماء کی جماعت الگ ہے۔ ملت کو حق حاصل ہے کہ جب جی چاہے حکومت کے فیصلوں کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اس صورت میں حکومت ان سے اپنے قانون کی اطاعت کرانے کی مجاز نہیں۔ حکومت اور قوم دونوں کو علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہونا ہوگا جو قرآن اور حدیث کی رو سے امر متنازعہ فیہ کا فیصلہ کریں گے۔ اور یہ فیصلہ حکومت اور قوم دونوں کے لئے واجب الاطاعت ہوگا۔ دیکھا آپ نے! "قیصر اور خدا" (دین اور دنیا) کی وہی تفریق جسے پاپائیت نے اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لئے وضع کیا تھا، کس طرح ہمارے تحت الشعور تک میں سرایت کر چکی ہے!

اس آیت مقدسہ کا صحیح مفہوم (کہ جو آیت اسلامی نظام حکومت کا ایک محکم اصول در آغوش ہے) یہ ہے کہ افراد ملت پر مرکزی حکومت اسلامیہ (جو اللہ اور اس کے رسول کی جانشین ہے) کی اطاعت لازم ہے اور ان افسران ماتحت (اولی الامر منکم) کی اطاعت بھی جو مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ہوں۔ لیکن ان افسران ماتحت کے فیصلوں کے خلاف ملت کو اپیل کا حق ہوگا اور یہ اپیل مرکزی حکومت کے ہاں دائر کی جائے گی

ہم نے اس آیت میں "اللہ اور رسول" سے مرکزی حکومت اسلامیہ مراد لی ہے۔ یہ ہمارا قیاس نہیں بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور ہم سے پہلے، بہت سے ائمۂ دین

علیہم الرحمۃ نے اس سے یہی مفہوم لیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن فوری وضاحت کے لئے آپ علامہ اسلم جیراجپوری کے اس مضمون کا بغور مطالعہ کیجئے جو اسی اشاعت میں دوسری جگہ وجہ ابتزاد کی بصیرت ہو رہا ہے۔

~~~ ❋ ~~~

اسد صاحب نے اصول نظام شرعی سے ہٹ کر ایک قانونی جزو سے بھی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظام اسلامی میں غیر مسلموں کو یہ تو حق ہوگا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ غیر مسلموں میں کریں لیکن اگر وہ اپنے مذہب کی تبلیغ مسلمانوں میں کریں گے تو یہ قانونی جرم ہوگا۔

لیجئے یہ ہے وہ "مذہبی آزادی" جو آپ کی اسلامی حکومت، غیر مسلم رعایا کو دیگی!

حضرت! اگر آپ کا اسلام ایسا ہی چھوئی موئی ہے کہ غیر مسلموں کے مذہب کی تبلیغ سے اس میں تزلزل و تذبذب کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو یاد رکھئے کہ آپ کی حکومت کے لاکھ تہدیدی قوانین بھی اسکی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔

مذہبی آزادی کے سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں کیا جائیگا کیونکہ قرآن میں لا اکراہ فی الدین کا حکم ہے۔

لیکن ان کا یہ "لا اکراہ فی الدین" کا حکم صرف غیر مسلموں تک محدود ہے۔ ایک مسلمان کو عقیدہ بدلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ روایات کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے۔

~~~ ❋ ~~~

بہر حال، تشکیل نظام اسلامی کے متعلق یہ پہلی کوشش ہے جو ہماری نظر سے گذری ہے۔ ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی تشکیل کا کام نہ ایسا مشکل ہے جیسا بظاہر سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اسلامی نظام کوئی ایسا ہوا ہے جس سے روح میں کپکپی پیدا ہو جائے۔ ملت اسلامیہ اپنے بہترین سے بہترین افراد، جن کے قلبی ایمان اور ذہنی فراست پر بھروسہ ہو منتخب کر کے ایک مجلس شوریٰ مقرر کریگی جو اپنے میں سے بہترین دل و دماغ کو اپنا امیر مقرر کرلے گی۔ یہ ہماری مرکزی حکومت ہوگی جو قرآن کریم

کے متعین کردہ حدود کے اندر، ہمارے زمانہ کے مقتضیات کے مطابق جزئی احکام مرتب کرے گی۔ ان جزئیات کی ترتیب میں ان تمام جزئیات سے استفادہ کیا جائے گا جو اس سے پیشتر وقتاً فوقتاً مرتب ہوتی رہی ہیں اور جو کتبِ احادیث وفقہ میں ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ ہمارا سرمایہ علم ہے جس سے تمتع لازم اور باعث فخر ومباہات ہے۔ اس طرح سے مرتب کردہ جزئیات کا مجموعہ ضابطۂ نظامِ اسلامی قرار پا جائے گا۔ قرآن کے ان اصولی حدود کی وضاحت بھی چنداں مشکل نہیں ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہماری ملت میں ایسے افراد موجود ہیں جو اس فریضہ کو بطریقِ احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔

ہم مجلس آئین ساز کے اراکین سے (جو اب پھر کراچی میں جمع ہو رہے ہیں) گذارش کریں گے کہ وہ کام کے ان فرسودہ طریقوں کو چھوڑیں جن میں معاملات، بھنور میں الجھی ہوئی لکڑی کی طرح، دن بھر کی گردش کے باوجود، شام کو وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ وہ ان واضح خطوط پر غور کریں جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد، انتخاب عامہ کے ذریعہ اس قسم کی مجلس شوریٰ کی تاسیس وتعمیر کریں جو قرآنی حدود کی روشنی میں ملت اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے نظام حکومت کی تدوین کا کام سرانجام دے۔ یہ ہے کرنے کا کام۔ الیس منکم رجل رشید؟

~~~~~~ ★ ~~~~~~

ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۸ء میں "محاسبۂ نفس" کے زیرِ عنوان حکومت کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تھی کہ غدارانِ ملت اور دشمنانِ پاکستان کا وہ طبقہ جو حکومت کے ایوانوں تک گھس آیا ہے یا خارجی اثرات سے حکومت کی مشنیری کو مفلوج کرنے کی فکر میں ہے، اس کا استیصال کیا جائے ورنہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت ان کی سازشوں کی حریف نہیں ہو سکے گی۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اربابِ حل وعقد کو اس خطرہ کا احساس ہو گیا اور مختلف گوشوں سے اس سے متعلق آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے قائدِ اعظم نے اپنی ڈھاکہ کی تقریر میں فرمایا۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے
~~~~~~

مالی امداد حاصل کرکے، پاکستان کے درپئے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں، آپ ان سے ہشیار رہیں اور ان کے دل کش نعروں اور جاذب توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں۔ (ڈان مورخہ ۲۳/۳/۴۸)

عین اسی تاریخ کو، کراچی میں وزیر خزانہ، غلام محمد صاحب نے، ایک پریس کانفرنس کے دوران میں کہا۔

مجھے یقین ہے کہ ملازمین کا طبقہ دل کا کھرا ہے۔ لیکن ان پر ایک ایسا طبقہ اثر انداز ہو رہا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کا دشمن اور بیرون پاکستان قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ حکومت کو بعض ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کا علم ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کو، حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کیلئے اکسائیں۔ ان میں سے بعض ہمارے معاشرتی نظام کے دشمن اور تشدد آمیز انقلاب کے حامی ہیں.... ان میں سے بعض کے متعلق ہمیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ وہ باہر سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی ایسے عناصر کے وجود کو برداشت نہیں کرسکتی۔ ہمارے ملازمین (ایضاً) حکومت کو محتاط رہنا چاہیئے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے دامِ فریب کا شکار نہ ہوجائیں۔

پھر وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب نے، ۱۳ر اپریل کو ایک بیان میں کہا۔

بعض سازشی گروہ (عنصرِ پنجم) ملازمینِ حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے مشئومہ عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکے کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کرکے نظامِ حکومت کو مفلوج کردیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمین حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔ (ڈان ۱۳/۴/۴۸)

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ حکومت کی یہ تشخیص بالکل درست ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہم نے اپریل کی اشاعت میں بہ صراحت لکھا ہے، دشمنانِ پاکستان کی فتنہ انگیزیوں کا علاج فقط اس قدر

نہیں کہ عوام یا ملازمین سے یہ کہدیا جائے کہ ان کی چالوں میں نہ آنا۔ جب تک حکومت عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرتی اور ملازمین کی جائز شکایات کا مداوا نہیں کرتی۔ دشمنان پاکستان کی کمزور سے کمزور سازش بھی کامیاب ہو جائے گی۔

اگر دشمنان ملک و ملت سرکاری ملازمین کو گمراہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی سازشوں کا جال کہیں زیادہ وسیع ہوگا۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکومت اس قدر ہوشیار ہے کہ اسے ایسی دشمن پاکستان جماعتوں کا علم ہے۔ لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے مدافعت کی کیا صورت کی؟ سرکاری ملازمین یا تو اپنے مطالبات میں مخلص ہیں اور جیسا کہ خود حکومت نے تسلیم کیا ہے "ان کے دل میں کھوٹ نہیں" یا وہ قصداً دشمن پاکستان جماعتوں کے معاون یا آلہ کار بن رہے ہیں۔ اگر وہ مخلص ہیں تو انہیں ایسی دشمن جماعتوں کے ناموں اور سرگرمیوں سے مطلع کر دینا چاہیئے تاکہ وہ نادانستہ طور پر ان کے جال میں نہ پھنس جائیں۔ اس کے برعکس اگر وہ قصداً اشرار میں پیدا کرتے ہیں اور دشمن پاکستان جماعتوں کے قصداً مؤید و مددگار ہیں تو ایسے غداروں سے وہی سلوک کرنا چاہیئے جو ہر غدار سے ہوتا چلا آیا ہے۔ حکومت بصورت اوّل ملازمین کو راز دار نہ بنا کر اور بصورت دیگر مجرمین کو کیفر کردار تک نہ پہنچا کر نہایت خطرناک کھیل کھیل رہی ہے۔ پہلی صورت میں وہ اپنے وفاداروں کو دشمنان ملک کا آلہ کار بنتے دیکھ رہی ہے اور خاموش ہے۔ اور دوسری صورت میں دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی گرفت اور تعزیر میں تغافل برت کر دشمنوں کو خطرناک ڈھیل دے رہی ہے۔ سرکاری ملازمین کا دشمنوں کا آلہ کار بن جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اگر فتنہ پردازوں کی سازشوں کا زہر اس وفادار طبقہ تک کو بھی متاثر کر رہا ہے تو حکومت اور ملک کی خیر نہیں۔ حکومت کے اندرونی نظام میں ایک پرزہ بھی خراب نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا یقیناً نہیں ہو سکتا بشرطیکہ حکومت فراست و تدبر سے کام لے۔

لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حکومت نہ صرف یہ کہ ان فتنوں اور سازشوں کا علاج ہی

عزم و استقلال سے نہیں کرتے بلکہ وہ خود تشخیص مرض میں بھی مستقل مزاج نہیں رہتے۔ چنانچہ یہی وزیر اعظم صاحب جنہوں نے ۱۳ر اپریل کو، ان سازشی گروہوں کے فتنہ کو پاکستان کا اصلی دشمن قرار دیا تھا۔ تین ہی روز بعد فرماتے ہیں کہ

> میرے نزدیک صوبائی تعصب ہی تنہا وہ خطرہ ہے جو نہ صرف مملکت پاکستان کو کمزور ہی کر دے گا بلکہ اس کی ہستی کو فنا کر دے گا۔ جو لوگ پاکستان کی دولت بنکر صوبائی عصبیت کی تبلیغ کرتے ہیں وہ مملکت پاکستان کے مہلک ترین دشمن ہیں۔
>
> (ڈان ۱۶-۴-۴۸)

اس میں کیا شبہ ہے کہ صوبائی تعصب، تخریب پاکستان کے لئے ایک زہر ہلاہل ہے اور طلوع اسلام اس باب میں بھی پہلے دن سے ارباب حل وعقد کی توجہ اس طرف منعطف کرا رہا ہے، لیکن یہ کہنا کہ صوبائی تعصب ہی تنہا اصلی خطرہ ہے ملت کی نگاہوں کو غداران ملت کی اندرونی سازشوں کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف پھیر دینے کا موجب بن جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر خطرہ کو اپنی اپنی جگہ رکھا جائے اور قوم کو ہر ایک سے آگاہ کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حکومت بیانات دیتے یا تقریریں کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلم لیگ کی لیڈری اور انکی امروزہ حیثیت میں بہت بڑا فرق ہے۔

کمیونسٹوں کی سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محترم وزیر اعظم صاحب نے راولپنڈی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

> اسلام بجائے خویش ایک مکمل معاشی نظام ہے اس لئے مسلمانوں کو، عوام کی معاشی مشکلات کے حل کے لئے کسی بیرونی معاشی نظام کی طرف نگاہ نہیں کرنی چاہیئے۔ قرآن اتحاد، مساوات اور اخوت کی تعلیم دیتا ہے اور اسی تعلیم میں ہماری تمام مشکلات کا حقیقی حل پوشیدہ ہے۔ (ڈان - ۷ر اپریل)

اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے اخبار ڈان نے اپنی ۶، اپریل کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا:-

> یہ بالکل واضح ہے کہ وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں لیکن کسی بیرونی معاشی نظام کو قرآنی نظام سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں، تو ایسے لوگ مسلمان ہی نہیں۔ خواہ رسمی طور پر دعویٰ ایمان بھی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ اور اپنے غیر اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے اسلام۔ اسلام" کیوں نہ پکاریں۔

ان بصیرت افروز حقائق کی صداقت میں کسے کلام ہے۔ لیکن فریق مقابل جب پوچھتا ہے کہ قرآنی نظام معاش، جسے آپ تمام نظامہائے عالم سے ارفع و اعلیٰ بتا رہے ہیں، ہمیں کہاں ملتا ہے تو فرمائیے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ اس کا اعتراض یہ ہے کہ اگر فی الواقعہ تمہارے پاس کوئی ایسا نظام موجود ہے تو اسے نافذ کیوں نہیں کیا جاتا؟ آپ جب مساوات اسلامی کا ذکر فرماتے ہیں تو وہ عوام سے کہتے ہیں کہ ذرا اپنے وزیر اعظم صاحب سے پوچھئے کہ کیا وہ مساوات یہی ہے کہ جو آپ ہیں اور ہم میں ہے کہ جہاں کوئی چیز بھی ساوی نہیں! کہئے کہ عوام آپ کی مانیں گے یا فریق مقابل کی! سوچئے کہ اثر اس کی بات کا ہوگا یا آپ کے بصیرت افروز حقائق کا! آپ انہیں الزام دیتے ہیں کہ یہ مذہب کے نام کو اپنے مقاصد کے بروئے کار لانے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ یہ شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ، "مذہب ایک افیون ہے" جو ان سرمایہ داروں اور دجاہت پرستوں نے اس لئے وضع کر رکھی ہے کہ جب عوام اپنی خستہ حالی سے تنگ آ کر انقلاب کے لئے اٹھیں تو انہیں اس افیون سے پھر سے سلا دیا جائے۔ وہ عوام سے یہ کہتے ہیں کہ تمہارے لیڈروں کے پاس نہ کوئی معاشی نظام ہے، اور نہ یہ کسی ایسے نظام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کا تفوق چھن جائے۔ یہ تمہیں قرآن، خدا، اسلام کے نام سے دھوکا دیتے ہیں۔ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اس کا عملی ثبوت کیوں نہیں پیش کرتے! کہئے کہ عوام کے جی کو یہ باتیں لگیں گی یا آپ کے مواعظ حسنہ!

ہم اپنے ان ارباب بست وکشاد سے ایک مرتبہ پھر گزارش کریں گے کہ اگر جیسا کہ وہ خود بتا رہے ہیں، ان لوگوں کی طرف سے خطرہ، ایک واقعی خطرہ ہے اور ایسا خطرہ کہ جو مملکت پاکستان کے لئے سخت نقصان کا باعث ہو سکتا ہے تو اس خطرہ کا ازالہ اس قسم کے وعظ سے نہیں ہو سکے گا۔ عوام کی مشکلات عملی ہیں۔ ان کا حل بھی عملی طور پر ہی ہو سکے گا۔ بھوک کا علاج روٹی کے سوا کچھ نہیں، عوام آپ کی ان مذہب کے نام پر اپیلوں سے زیادہ متاثر نہیں ہو رہے۔ اور یہ عین فطری چیز ہے۔ وہ اپنے مصائب کا حل چاہتے ہیں اگر آپ اس کا حل پیش نہیں کر سکیں گے تو جو شخص بھی انہیں ان کا حل بتائے گا وہ اس کی طرف چلے جائیں گے اس لئے ہم باادب گذارش کریں گے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔

جس قرآنی نظام معاش اور اسلامی مساوات کا آپ ذکر فرماتے ہیں اسے قوم کے سامنے لائیے اور عملاً نافذ کیجئے۔ یہی ان خطرات کا حل ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

ہم نے مارچ کی اشاعت میں، "محاسبۂ نفس" کے زیر عنوان یہ بھی لکھا تھا کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ تقسیم ہند کے وقت ہم سے بعض کوتاہیاں ہوئیں اور اس کے بعد ہم جن مصیبتوں کا شکار ہوئے ان کی زیادہ وجہ خود ہماری اپنی خامیاں اور مآل نا اندیشیاں تھیں۔ اس اعتراف حقیقت سے فائدہ یہ ہوگا کہ ہم آئندہ کے لئے محتاط ہو جائیں گے اور اپنی کمزوریوں اور خامکاریوں کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ہمارے ارباب حل وعقد غالباً اس ڈر سے کہ اس اعتراف سے کہیں وہ قصوروار نہ ٹھہرا دیئے جائیں قوم کو یہ جھوٹا اطمینان دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کی یہ تمام قربانیاں حصول آزادی کی خاطر تھیں جو ہر قوم کو دینی پڑتی ہیں۔ اس لئے انہیں ان قربانیوں پر خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ہمارے محترم وزیر اعظم صاحب نے ایک اجتماع میں فرمایا۔

مسلمانان ہندوستان نے پاکستان بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ تاریخ اس قسم کی

گراں قدر قربانیوں کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ کسی قوم کو حصول آزادی کے لئے ایسی قربانیاں نہیں دینی پڑیں جیسی کہ حصول پاکستان کے لئے دینی پڑی ہیں۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ لاتعداد خانماں برباد کردیئے گئے اور ان کا سب کچھ لٹ گیا انہیں اس حالت میں پاکستان آنا پڑا۔ (ڈان ۱۶ مئی ۴۸ء)

وہ کونسی آنکھ ہے جو مسلمانوں کی اس عدیم المثال تباہی پر خونناب فشاں نہیں، اور طلوع اسلام کی "دیدۂ بینائے قوم" تو کسی وقت بھی اپنے آنسو تھام نہیں سکی۔ لیکن ان تباہیوں اور بربادیوں کو "حصول آزادی کے لئے قربانیاں" قرار دیدینا خود فریبی ہے۔ اور طلوع اسلام اس لئے اس کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ قوم اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہے جس سے وہ ضعیفی و کمزوری کے مرگ مفاجات اور طاغوتی قوتوں کے خلاف نبرد آزمائی میں جام شہادت میں فرق کرنا بھول جائے۔ یا وہ فرار کو ہجرت اور متاع بردہ کو انفاق فی سبیل اللہ سمجھنے لگ جائے۔ اول تو یہ دیکھئے کہ یہ "قربانیاں" حصول پاکستان کے بعد دینی پڑی ہیں۔ حصول پاکستان تک تو ملت کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ قائد اعظم کی سلامت روی کی سیاست نے، تمام عرصۂ جد و جہد میں ایک رضاکار کو جیل تک نہیں جانے دیا تھا۔ اس لئے "قربانیاں" حصول پاکستان کے لئے نہیں تھیں پاکستان ہمیں بغیر قربانیوں کے مل گیا تھا۔ اگر پاکستان قربانیوں سے مشروط ہوتا تو اس کے لئے ہمیں شاید ابھی دو تین نسلوں تک اور انتظار کرنا پڑتا۔

پھر جس انداز سے مسلمان تباہ ہوا ہے اسے قربانی سے تعبیر کرنا۔ اس جوہر بے بہا کی ہتک ہے۔ قربانی میں انسان، اپنے نصب العین کی مدافعت میں، پورے عزم و یقین کے ساتھ، خطرات کے مقابلہ کے لئے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اگر خطرات کا سیلاب بے پناہ ہو تو ہنستا ہوا، مردانہ وار جان دیدیتا ہے۔ لیکن اپنی آن پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ مسلمان بیچارا تو باندھ کر مارا گیا۔ وہ تو بے خبری میں ہلاک ہو گیا۔ اسے کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا گیا اور وہ موت سے بھاگتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا۔ لہذا اس قسم کی موت کو شہادت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ آتش نشاں کے لاوے میں بھسم ہونے والے گلزار ابراہیمی کے شائستہ نہیں کہے جاسکتے۔ قصاب کے بکرے کے خون اور مرد جانباز کے لہو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کوئی حقیقت بین، دست

تو سنگ آمدہ " کو پیمانِ وفا " نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! مسلمان قربانیوں کے جوہر دکھا سکتا تھا اگر اس کے اکابر اسے تنہا چھوڑ کر نہ بھاگ آتے۔ اس وقت اس کی قربانیاں دیکھتے اور پھر ان قربانیوں کا وہ زندہ نتیجہ کہ جس دہلی کے لال قلعہ پر آج ہلالی پرچم لہراتا نظر آتا۔ جو قوم شہید گنج کی بوسیدہ اینٹوں کی خاطر جانیں دے سکتی ہے وہ اپنے عزت و ناموس تک کو درندوں کے پنجوں میں چھوڑ کر کبھی بھاگ نہ کھڑی ہوتی۔ اس کے باوجود ایسے ایسے چمکنے والے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ بعض جسور و غیور مسلمانوں نے ہنستے ہوئے جانیں دیدیں لیکن اپنی آبرو کو پامال ہوتے نہ دیکھا۔ لیکن یہ سب کچھ انفرادی تھا۔ اجتماعی طور پر ہمیں اعتراف کرنا ہوگا کہ یہ تباہیاں حصولِ آزادی کیلئے قربانیاں نہ تھیں، ہماری خامیوں کے غیر متبدل نتائج تھے۔ اسی اعتراف میں ہمارے آئندہ استحکام کا راز ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص مٹانے کیلئے، حکومت ہند نے اپنی ترکش کا آخری تیر بھی استعمال کر لیا اور ایک ریزولیوشن کے ذریعے، جداگانہ جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیدیا (بجز ان کے جو صرف مذہبی، ثقافتی، معاشرتی اور تعلیمی امور سے متعلق ہوں۔ اور مذہب کے متعلق، ہندوؤں کا جو خیال ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے) ہندوستان کی پارلیمان میں اس ریزولیوشن پر بحث کرتے ہوئے جو تقاریر کی گئیں وہ اس ذہنیت کی صاف صاف غمازی کر رہی ہیں جس کی بنا پر اس ریزولیوشن کو پاس کیا گیا ہے۔ مثلاً مسٹر آئنگر نے اس ریزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے پہلے فرقہ وارانہ تحریکوں کے نقصانات کا ذکر کیا (اور سب سے بڑا نقصان خود تقسیم ہند کو بتایا)، اور اس کے بعد کہا۔

> اب سوال یہ ہے کہ اس تاریخی منظر کے بعد، کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم انہی پامال راہوں پر چلتے جائیں۔ یا ضروری ہے کہ اب ہم ایسی نئی راہیں تلاش کریں جن سے اس تشتت و انتشار میں وحدت پیدا ہو جائے، اس مقصد کے لئے وحدت پیدا کرنے کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرنا ہوگا جو مذہب سے زیادہ پائدار ہو۔ نظری طور پر نصب العین کے لئے، انسانیت مذہب، اور خدمتِ خلق۔ عبادت بالکل درست ہے۔ لیکن اس نصب العین تک پہنچنے

کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم دنیاوی خطوط پر ایک قوم متشکل کریں۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ ہر ہندوستانی کو اوّل و آخر ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ اور بس۔ ہمارے راستے میں مشکلات ضرور حائل ہوں گی۔ لیکن جب دوسری اقوام مثل امریکہ اور روس نے، مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگوں کو ایک قوم میں تبدیل کر دیا ہے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہندوستان اس باب میں ناکامیاب کیوں نہ ہو۔؟

ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے کہا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اقلیتوں کو ضرور خدشہ ہوگا کہ اگر ہم نے اپنے مخصوص جداگانہ حقوق کو چھوڑ دیا تو اکثریت ہمیں کچل کر رکھدے گی۔ لیکن، جیسا کہ وزیر اعظم نے فرمایا ہے۔ اب انگریز یہاں سے چلا گیا۔ اب ہر اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے۔ اکثریت ہی کی پناہ ڈھونڈنی پڑے گی (ہندوستان ٹائمز ۲۴-۴-۴۸)

یہ اقتباسات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ یہ ہندوؤں کی طرف سے تھا۔ اس کے بعد مسٹر تجمل حسین صاحب نے فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے مخلوط شادیوں کو رواج کرنا چاہیئے۔ (جس طرح اکبر نے کیا تھا۔ لیکن اکبر تو ہم غالب سے متعلق تھا۔ اب مسلمانوں کی لڑکیاں ہندوؤں کے حبالہ جائیں گی بشرطیکہ ہندوؤں نے اسے پسند فرمایا)

پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ وہاں کے مسلمانوں سے، وفاشعاری کے ثبوت میں کیا کیا تقاضے کئے جا رہے ہیں۔ اچاریہ کرپلانی، سابق صدر کانگرس، نے پچھلے دنوں نئی دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں کہا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ جوق در جوق حیدرآباد جائیں اور اس ریاست میں اپنے ہم مذہب مسلمانوں کی دہشت انگیز کارروائیوں کا خاتمہ کریں۔ وگرنہ ان کا دعویٰ وفاشعاری بالکل بے معنی سمجھا جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمان حکومت ہند سے وفاداری اور اطاعت شعاری کے اعلانات کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ان اعلانات

پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں جبکہ حالت یہ ہے کہ ان کے بھائی جہاں بھی دستِ غالب رکھتے ہیں ہندوؤں پر ظلم توڑنے سے باز نہیں رہتے۔ (ڈان ۱۵ مئی)

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے دلیلِ وفاداری کے لئے کیا مطالبات کئے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں جیسی تنگ نظر اور دنی الطبع قوم، دنیا میں شاید ہی کہیں ہو۔ ایسی قوم کی محکومیت جہنم کا عذاب ہے۔ حافظ نے کہا تھا کہ

بندۂ طلعت آں باش، کہ آنے دارد

محکومیت ایسے ہی کچھ کم لعنت نہیں لیکن ایسی قوم کی محکومیت جس میں آن نہ ہو، بدترین عذاب ہے۔

پھر ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے خلاف یہ کچھ کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف مملکت پاکستان کے ساتھ ترافنی مابین سے اس قسم کے عہد نامے بھی ہو رہے ہیں جن کی رُو سے اقلیتوں کے جملہ حقوق اور مفاد کے تحفظ کی ذمہ داریاں لی جاتی ہیں۔ (ڈان ۲۰ مئی) ایسی قوم کن کن طریقوں سے ستاتی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں ان کے ساتھ واسطہ پڑ رہا ہو۔ ہم جیسا کہ روزِ اوّل سے کہتے چلے آ رہے ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ پاکستان کے مسلمانوں کا اوّلین فریضہ اور اہم ذمہ داری ہے۔ اس وقت پاکستان کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کے پیشِ نظر اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دینا مشکل ہے۔ لیکن زود یا بدیر اس مسئلہ کا حل سوچنا ہی پڑے گا۔ اور ہمارے خیال میں اس کا حل سوائے اس کے اور کیا ہو سکیگا کہ کوشش کی جائے کہ ہمارے جس قدر علاقے غیر آباد پڑے ہیں وہ آبادی کے قابل ہو جائیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ لوگ بسائے جا سکیں۔ یہ مسئلہ کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے لئے صرف عزم و ثبات کی ضرورت ہے۔ اگر ہم تہیہ کر لیں کہ ہم نے یہ کام کرنا ہے تو زندگی کو اس نہج پر ڈھالا جا سکتا ہے جس سے اتنی کفایت ہو سکے کہ ہم ان غیر آباد زمینوں کو، مختلف اسکیموں کو بروئے کار لا کر، قابلِ آبادی بنا دیں۔ دور کیوں جائیے یہاں سندھ اور بلوچستان میں اتنے وسیع علاقے غیر آباد پڑے ہیں کہ اگر انہی کو آبادی کے قابل بنا دیا جائے تو ہماری اس بہت بڑی مشکل کا بہت بڑا حصہ حل ہو جاتا ہے۔ لیکن

کو قوم کو سمجھنا ہے کہ ہم ایک اہم آزمائش و ابتلا کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اس قسم کے دور آزمائش سے جس میں یورپ کی قومیں چھ برس تک (دوران جنگ میں) اور اس کے بعد آج تک، مبتلا چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم اپنے اوپر آپ اس قسم کی پابندیاں عائد کرلیں تو یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں۔

لیکن ان چیزوں کے لئے پختگیٔ کردار کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی ہم میں مفقود ہے۔

کراچی میں یوم اقبال کے پروگرام کے متعلق ایک بسیط مضمون الگ شائع ہو رہا ہے۔ اُن کاپیوں کے پریس میں جانے کے وقت تک اس "دلچسپ" تقریب کی ہنوز ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ بارے ان کاپیوں کی تکمیل کے وقت بعض احباب کی زبانی سرقع رنگ و چنگ کی بعض جھلکیاں ہمارے لئے فردوس گوش بنیں جنہیں قارئین طلوع اسلام تک نہ پہنچانا بخل معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ قلت گنجائش کی وجہ سے ہم اس محفل نغمہ و تعطر کا محض اجمالی سا تعارف ہی کرا سکیں گے۔

پہلے دن "ختم قرآن برائے ایصال ثواب" کی محفل تھی جس میں سنا ہے کہ چند "دقیانوسی" خیالات کے لوگوں کے علاوہ کسی نے زحمتِ شرکت گوارا نہ کی۔ ویسے بھی یہ محفل اسی قبیل سے تھی جیسے مجلس رقص و موسیقی کے دعوتی رقعوں پر تبرّکاً "۷۸۶" لکھ دیا جاتا ہے۔

دوسرے دن "یوم مقالات" تھا جس میں حاضری نسبتاً زیادہ تھی۔

تیسرے دن مجلس قوالی تھی جس میں شریک ہو کر سعادت دارین حاصل کرنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اقبالؔ کی ہنسی اڑانے کیلئے قوالی ہی کچھ کم سامانِ ماتم نہ تھی کہ وہاں رہی سہی کسر نکالنے کے لئے فلمی مسخرہ "انڈین چارلی" کے بھانڈپن کی ایک نقل بھی وجۂ تدفین غیرت ملی اور سنا ہے کہ اس محفل میں، حکومت پاکستان کے بڑے بڑے عمائدین عظام بھی شرکت فرما تھے۔

ؔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ چیز بجائے خویش قرآن کی میزان میں کیا وزن رکھتی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قرآن کے نام سے لگاؤ کتنوں کو ہے۔

اور چوتھے دن مشاعرہ۔ اس کی ہماہمی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ادھر، جوانی کی خاطر جوانی لٹانے والوں کی صفوں کی صفیں، اُدھر دشمنانِ ایمان و آگہی اور رہزنانِ تمکین و ہوش کے پرے کے پرے۔ اور اس پر رنگ افزائی محفل یوں کہ

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب

اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

یوں گوکل کے باسیوں اور کنھیا کی گوپیوں نے مل کر، آزاد پاکستان میں حکیم الامت، ترجمان القرآن، بانیٔ تصورِ پاکستان کی پہلی برسی منائی۔

آسماں راحق بود گرخوں ببارد بر زمیں

سندھ اور پنجاب میں وزارت کے باہمی اختلافات و تنازعات کے متعلق ہمارے کرنے کی صدائے درد ناک کسی دوسری جگہ وجۂ سمع خراشی ہوگی۔ یہ آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی کہ اطلاع ملی کہ سندھ کے وزیر اعظم مسٹر کھوڑو کو برطرف کر دیا گیا ہے۔

جب کسی نظام میں فساد (Corruption) اس قدر عام ہو جائے جیسے تشکیلِ پاکستان کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا علاج پنجۂ آہنی کی گرفت کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو لکڑیوں سے جکڑ کر باندھتے ہیں تاکہ وہ پھر سے جڑ جائے۔ اس طریقِ علاج کو جبارت کہتے ہیں۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ امیرِ پاکستان، محترم قائد اعظم، نے اس طریقِ علاج کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ہر چند اس کی بہت پہلے ضرورت تھی لیکن خیر۔ اس کی ابتدا تو ہو گئی۔ اب امید ہے کہ یا تو دوسرے مقامات پر اسی سے عبرت پکڑ لی گئی یا پھر ان کی بھی باری اس طرح آ گئی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صوبوں سے زیادہ خود مرکز میں اس عمل جراحی کی ضرورت اشد ہے۔ مرکز قلبِ مملکت ہوا کرتا ہے اور اس کے فساد سے سارا نظام جسمانی متاثر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اعضاء و جوارح سے کہیں زیادہ قلب کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔

سابقہ اشاعت میں، جناب پرویز کا بصیرت افروز مقالہ "وراثتِ ارض کا ابدی قانون" شائع ہو چکا ہے۔ اشاعت پیشِ نظر میں "تسلیم کے نام خط" میں اسی مقالہ سے متعلق، بعض نکات کی وضاحت کی گئی ہے یہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا کہ اب ہمارے پاس اپریل کی اشاعت کا کوئی پرچہ بھی نہیں رہا اور ڈیمانڈ بدستور جاری ہے۔ طلوعِ اسلام کے دورِ اول میں اس قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا گیا تھا کہ اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا جو ہزارہا کی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی ابتدا پرویز صاحب کے مذکورہ صدر مضمون سے کی جا رہی ہے۔ پمفلٹ عنقریب چھپ کر تیار ہو جائے گا۔

اشاعتِ زیرِ نظر میں، مسلم لیگ کی تنظیم کے متعلق ایک اہم مضمون شائع ہو رہا ہے جو اربابِ فکر و نظر کی گہری توجہ کا محتاج ہے۔ ہم نے اس میں یہ بتایا ہے کہ ہمارے نزدیک، پاکستان میں، کسی پارٹی کی ضرورت نہیں، اس لئے مسلم لیگ کی بھی ضرورت نہیں۔ مسلم لیگ کا نصب العین ہے

پاکستان کا استحکام بدیں مقصد کہ یہاں شرعی نظام قائم کیا جائے۔

اگر کوئی پاکستانی، پاکستان کا استحکام نہیں چاہتا تو وہ حکومت کا غدار ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان، شرعی نظام کا نفاذ نہیں چاہتا تو وہ مسلمان ہی نہیں۔ لہٰذا مذکورہ صدر نصب العین، پاکستان کے ہر مسلمان کا نصب العین ہے۔ اس لئے اس نصب العین کے لئے کسی پارٹی کی کیا ضرورت ہے۔ پارٹی کی ضرورت انہیں ہونی چاہیئے جس کا نصب العین اس سے الگ کچھ اور ہو۔ باقی رہا یہ کہ انتظامی سہولیت اور ملت کے افراد کو ایک اجتماعی رشتہ میں منسلک کرنے کیلئے ایک (organisation) کی ضرورت ہوگی سو اس کے لئے پارٹی بنائے بغیر بھی نہایت عمدہ عملی پروگرام بنایا جا سکتا ہے۔ جس کا خاکہ، اسی مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم اربابِ نظر سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری معروضات کو توجہ سے ملاحظہ فرمانے کے بعد، اس باب میں، ہمیں اپنے خیالات و آراء سے مستفیض فرمائیں جس کے لئے ہم شکرگذار ہوں گے۔

یومِ اقبال کی تقریب پر ہمارے محترم جناب پرویز صاحب نے، بکمال کرم گستری ہمیں ایک مقالہ، بعنوان "اقبال کا پیام نوجوانانِ ملت کے نام" عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے بصمیم قلب شکرگذار ہیں۔ اس مقالہ کو ہم اپنی اولین فرصت میں "ربینِ" تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

قرآنی تعلیم

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

پاکستان قائم ہوتے ہی مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے "اسلامی حکومت" اور "قانونِ شریعت" کے مطالبات شروع ہوگئے۔ ابتک جو مطالبے پیش کئے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کا صحیح خاکہ، اس کا نظام اور اس کا طریقِ عمل ان حضرات کے دماغوں میں بالکل نہیں ہے۔

ان علماء اور مذہبی پیشواؤں سے میری گذارش یہ ہے کہ وہ کسی مطالبہ سے پہلے قرآنِ کریم سے اسلامی نظامِ حکومت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں۔ ان کے اوپر واضح ہوجائے گا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے اسلامی حکومت میں جو استبداد آگیا تھا اور جو رفتہ رفتہ ملت کی تباہی کا باعث ہوا یہاں تک کہ اس کا تقریباً ۲/۳ حصہ مشرق سے مغرب تک کفر سے مغلوب اور کفار کا محکوم ہوگیا اس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کی دو ہی جماعتوں پر ہے، یعنی علماء پر اور ملوک پر۔

یہ مستبد سلاطین اپنی شخصی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھتے رہے۔ چند مذہبی فرائض نماز، روزہ، حج وغیرہ کا ادا کرلینا ہی ان کے نزدیک اسلام تھا اور مہمات اصولِ اجتماعی جو قرآن نے تلقین کئے ہیں ہمیشہ ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ علماء بالعموم انھیں کے تابع اور انھیں کے حامی رہے اور یہ کبھی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان سلاطین کی شخصی اور استبدادی حکومتوں کو مٹانا قرآن کی رو سے ہمارا اولین فرض ہے۔ ان میں سے جو زیادہ اہلِ تقویٰ و دیانت تھے انھوں نے بھی بجز اس کے کچھ نہ کیا کہ اپنی کتابِ زندگی میں ایک باب "درحذر کردن از خدمتِ بادشاہاں" کا اضافہ کرلیا۔

الغرض جب سے مسلمانوں میں بادشاہت آئی یہ اسلامی سیاست کے نادان دوست رہے جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی جبکہ دنیا میں ہر قوم کی حکومت جمہوری ہو رہی ہے، مسلمانوں میں افغانستان اور ایران سے لیکر مصر تک شخصی حکومتیں قائم ہیں۔ بلکہ عرب میں جہاں سے جمہوریت اور مساوات کا چشمہ ابلا تھا آج پوری دس مطلق العنان استبدادی حکومتیں قائم ہیں۔ اور حیرت ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک یہ سب اسلامی حکومتیں ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت اسلامی خلافت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور نہ شاید اس کا یہ دعویٰ ہے کیونکہ خلافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی ہے۔ جس کے زیرِ حکومت پوری ملت کو ہونا چاہئے اور پاکستانی حکومت صرف ایک مخصوص منطقہ میں ملت کی جزی حکومت ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ استبدادی اور شخصی نہیں بلکہ جمہوری ہے جس کے باعث خلافت اور حکومتِ الٰہی سے قریب تر ہے۔

اس وقت جن جن خطوں پر مسلمانوں کی جزی حکومتیں ہیں ان کی دو نوعیتیں ہیں۔ یعنی استبدادی اور جمہوری۔ اگر پوری ملت نے جیسا کہ اس کا فریضہ ہے خلافت قائم کی تو جمہوری مسلم حکومتیں اسکی حمایت بھی کریں گی اور اس میں شریک بھی ہوں گی۔ لیکن استبدادی بتوں کا توڑنا آسان نہ ہوگا۔ وہ اپنی پوری طاقتیں اپنے تشخص کو برقرار رکھنے میں صرف کریں گے اور اس وقت ملت کو معلوم ہو جائے گا کہ جن کو ہم مسلمان حکومتیں سمجھے بیٹھے تھے وہ کس قدر نامسلم تھیں۔

قرآن کی رو سے جملہ مسلمانانِ عالم پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ خلافت قائم کریں۔ اور اس کو انہیں اصول پر قائم کریں جو قرآن میں بیان کئے گئے ہیں، یہ اصول میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں جو عرصہ ہوا طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے قرآنی دلائل کے ساتھ واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں اور پھر اس سے بھی زیادہ مدلل اور مفصل طریقہ سے اپنی کتاب تاریخ الامت کے حصہ ہشتم میں ان کو لکھ دیا ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ اصول یہ ہیں۔ قرآن حکومت کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کے محکوم نہ بنو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

آج کل جمہوریت اور آمریت دو قسم کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن قرآن مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ آمریت کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقِ حکومت جمہور کو حاصل ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں۔ اس حق سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ اور آمریت میں مختار ناطق کی ذات میں حکومت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کسی انسان یا انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا۔ بلکہ اس کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔ وہی بلا شرکتِ غیرے حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۱۸/۱۵

اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا۔

انبیاء کرام تک کو بھی جو بنی نوعِ انسان کا سب سے بلند طبقہ ہے اس نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی کو اپنا محکوم بنائیں۔ بلکہ صرف یہ کہ لوگوں کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ـــ

کسی شخص کو جسے اللہ کتاب اور حکم اور نبوۃ دے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بنو بلکہ یہ کہ تم اللہ والے بنو، اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے ہو۔

اس لئے ملتِ اسلامیہ کی مرکزی جماعت خود حکمران نہیں ہے بلکہ صرف قوانینِ الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ وہ ہنگامی ضروریات کے لئے جو ضوابط تیار کرے گی ان میں کوئی قانون ایسا نہیں بنا سکتی جو قرآن کے خلاف ہو۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۵/۴۷

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے اصول کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فاسق ہے۔

الغرض حکومت صرف اللہ کی ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایات اور ان کی عقلوں کو صحیح راہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کو واضح کرنے کے لئے ایک ناقابلِ تغیر و تبدل کتاب قرآنِ عظیم کو اتار دیا ہے کہ اس کے مطابق عمل کر کے وہ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہان کی اطاعت سے بے نیاز ہو جائیں۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۶/۱۴

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔

یہی مبارک کتاب ملتِ اسلامیہ کے لئے انفرادی اور اجتماعی دستور العمل ہے۔ جس طرح حکومت کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اسی طرح اس کے سوائے کسی کی اطاعت بھی نہیں ہے۔ امتِ اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصودِ حیات صرف اللہ کی رضامندی ہے جو اسی کی اطاعت سے مل سکتی ہے۔ لیکن اللہ خود اطاعت لینے کے لئے نہیں آتا بلکہ رسولوں کو بھیج کر ان کے ذریعہ سے اپنی اطاعت لیتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۵/۹

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ بحکمِ الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

پھر یہ بھی تصریح کر دی کہ یہ رسول کی اطاعت، عین اطاعتِ الٰہی ہے۔ کیونکہ وہ بحکمِ الٰہی ہے۔

وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۵/۸

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

جن لوگوں نے دنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی تھی وہ جب قیامت میں نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو جہنم میں جلتے ہوئے کہیں گے۔

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا۔ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا۔ ۹/۲۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ممتاز منصب تھے۔

پہلا منصب پیغمبری۔ یعنی لوگوں کے پاس پیغام الٰہی کو بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس کے امتیازات یہ ہیں۔

(۱) اس منصب کی رو سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ اور یہ امت ہمیشہ کے لئے آپ ہی کی امت ہوئی۔

(۲) یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم کر دی گئی اور آپ اس کی تکمیل کے لئے بھیجے ہی گئے تھے۔

(۳) اس حیثیت سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے لازم کر دیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔ ۵/۶۷

اے رسول! جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دے۔ اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

دوسرا منصبِ امامت۔ یعنی احکامِ الٰہی کے مطابق لوگوں کو چلانا، ان کے باہمی تنازعات اور قضایا کے فیصلے کرنا۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور رہنمائی وغیرہ۔ اس کے امتیازات یہ ہیں۔

(۱) یہ امامتِ کبریٰ جو آپ نے بحکمِ الٰہی بنی نوعِ انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح و فلاح کے لئے قائم کی، آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک مستمر ہے، جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے قائم رہنی چاہیے۔

(۲) آپ کے بعد آپ کے خلفاء یعنی جانشینوں کے وہی اختیارات ہوں گے جو اس لحاظ سے آپ کے تھے، اور ان کی اطاعت بعینہٖ اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔

(۳) اس حیثیت سے آپ لوگوں سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ ۳/۱۵۹

اور ان سے امر (حکومت) میں مشورہ لیا کرو۔

جیسا کہ مذکور ہوا قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ منصبِ امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے جملہ خلفاء داخل ہیں۔ ان خلفاء کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مرکزِ امت یعنی خلیفہ یا امام کے لئے یہی لفظ یعنی "اللہ و رسول" استعمال کیا ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے جن کا فریضہ یہ ہے کہ منصبِ امامت کو قائم رکھیں اور امت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔ اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ۝

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو حکام ہوں ان کی اطاعت کرو۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے۔ اس کی اطاعت ہوگی رسول (مرکز) یا اس کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے حکام کے ذریعہ سے۔ ان حکام کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر جمہور کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو ان کو حکام کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو اُن کا فیصلہ کردے گا۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝

کسی مومن مرد یا عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار نہیں رہ جاتا جبکہ مرکز اس کا فیصلہ کردے اور جو کوئی مرکز کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہی میں پڑ جائے گا۔

یعنی مرکز دینی اور دنیاوی امور میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اس وقت سے انھوں نے اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علماء آگئے۔ جن کے باہمی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا بھی آج تک قرآن و حدیث سے فیصل نہ ہوسکا۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعے سے ہوسکتی ہے جو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق امت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیث رسول ہے نہ علماء اولوالامر ہیں۔ قرآن نے احبار و رہبان پرستی اور برہمنیت و پاپائیت کو فنا کردیا ہے۔ اور سوائے اللہ کے کسی کو مطاع نہیں قرار دیا ہے۔ علماء صرف معلم ہوسکتے ہیں، راہبر نہیں ہیں۔

قرآن نے اسلامی حکومت کو شوریٰ قرار دیا ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

اور ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہے

اس لئے خلیفۂ وقت کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ اور قرآن کے حکم "شاورھم فی الامر" کے مطابق خلیفہ مامور ہے کہ ان اہلِ شوریٰ کے مشورہ سے کام کرے۔ خلیفہ اور مشیروں کی یہی جماعت حکومت کی مرکزی جماعت ہے جس کا اصولی قانون صرف کتاب اللہ ہے۔ اس نے موٹے موٹے اصول جو نشانِ راہ کا کام دیں بیان کر دیئے ہیں اور ہر زمان و مکان میں ہنگامی ضروریات کے لئے ضوابط بنانا انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے اور اس کو پوری آزادی دی ہے بجز اس کے کہ قرآن کے متعین کئے ہوئے حدود ٹوٹنے نہ پائیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ ۱۰۵/۴

ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سجھائے اس کے مطابق لوگوں میں فیصلے کر۔

مرکز کو شدید تاکید کی گئی کہ قرآنی تعلیمات سے غفلت اور اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۔

ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اور ان کے خیالات کے پیچھے نہ جا اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے بہکا کر وہ تجھ کو فتنہ میں نہ ڈال دیں۔

یعنی لوگوں کی زوردار تقریروں سے کہیں تیرے پائے ثبات کو قرآنی حدود سے لغزش نہ ہو جائے۔

یہ امر خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہے کہ قرآن نے ہر جگہ سند کے لئے "بما انزلنا" کو مخصوص فرمایا ہے۔ اس لئے کہ وہی دائمی حق اور اٹل ہے۔ اس کے سوا دین اور حکومتِ الٰہی میں کوئی شے سند نہیں۔

تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد اسلامی حکومت اگرچہ خلافت کے نام سے چل رہی تھی مگر وہ مستبد شہنشاہی تھی جو قرآن کی رو سے قطعاً ناجائز ہے۔ اس لئے ملت کے سامنے صحیح نمونہ

وہی حکومت ہے جو عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ میں تھی۔ اب جو اہلِ علم ایسے ہیں کہ وہ قرآن سے صحیح احکام نکال سکتے ہیں اور غلط علوم نے جو غلامی کے زمانوں میں مسلمانوں میں رائج ہوئے ان کے دماغوں کو ماؤف نہیں کیا ہے ان کا فریضہ یہ ہے کہ آئینی طور پر بذریعہ انتخاب کے دستور ساز جماعت میں آئیں اور قرآن کے مطابق ضابطے بنوائیں تاکہ وہ جمہوری ہو جائیں۔ ورنہ ان کے مطالبات محض شخصی رائیں ہیں جن کی زیادہ قیمت نہیں۔

پاکستانی حکومت جمہوری ہے جو ملک کے ہر فرد کا حق ایکساں اور برابر سمجھتی ہے۔ ایسی حکومت کی اصلاح بہت آسان ہے۔ وہ اگر خلوص اور تقویٰ کے ساتھ قانون سازی میں قرآن کریم سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کے قول اور عمل میں برکت دے گا اور ضرور ان کو کامیاب کرے گا۔

می تواں کردن

(ڈاکٹر سید اکرام حسین عشرتؔ آبادان، ایران)

متاعِ عشق دستیہا فراواں می تواں کردن — نگاہ آتشیں بر روئے جاناں می تواں کردن
بجز اے مردِ حر تجدیدِ پیماں کن کہ در بزمش — علاجِ دردِ دل بے ظرفِ درماں می تواں کردن
مشو نومید از بربادیٔ کشتِ گل و لالہ — کہ در ویرانہ ہم گاہے بہاراں می تواں کرد
چہ باک از قوتِ باطل چہ ترس از ساز و سامانش — کہ کارِ دوست بے شمشیر و پیکاں می تواں کرد
اگر مرگِ شرافتمند باشد مقصدِ ہستی — بگیر از من کہ بازی با نہنگاں می تواں کرد
رموزِ لَا و اِلَّا اللّٰہ چوں بے پردہ تر گردد — قیامت ہا بپا در بزمِ امکاں می تواں کرد
کسے کو آشنائے سرِّ توحید است می داند — جہاں زیر و زبر بازورِ ایماں می تواں کرد

من اے عشرتؔ ہنوز اندر دلم بت خانہ ہا دارم
چساں گویم کہ کافر را مسلماں می تواں کردن

سلیم کے نام ....

بہ سلسلۂ "وراثتِ ارض" — صلاحیت اور صالحیت کا فرق

پرویز

[طلوعِ اسلام کے دورِ اول میں محترم پرویز صاحب نے "سلیم کے نام خطوط" کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا جو اپنی افادیت اور جاذبیت کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ جب کبھی اس سلسلہ میں تاخیر ہو جاتی تھی تو اس کے لئے پیہم تقاضے موصول ہوا کرتے تھے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ جناب پرویز نے اس سلسلہ کو پھر جاری فرما دیا۔ پہلا (اور اگر اسے دورِ اول سے مسلسل قرار دیا جائے تو غالباً دسواں) خط آپ کے پیشِ نظر ہے۔ دیکھئے کہ ان خطوط میں جناب پرویز نہایت اہم اور مشکل حقائق کو کس سلاست اور شیرینی سے حل کر جاتے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ اس وقت تک شائع شدہ خطوط کو ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ یہ چیزیں نایاب ہیں اور مستقل طور پر پاس رکھنے کے قابل ہیں۔ مدیر طلوعِ اسلام]

ہاں سلیم! تم نے ٹھیک کہا۔ قریب چھ سال کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یوں تو سال بھی صبح اور شام کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "وقت" کے لامتناہی سلسلہ پر یہ نشانات، ہم نے حساب و شمار کی سہولیت کی غرض سے لگا رکھے ہیں، جیسے گز پر گرہیں لگا دی جاتی ہیں۔ ان گرہوں کا وجود اعتباری ہوتا ہے، فی الواقعہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دن، مہینے، سال، وقت کے گز پر گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا وجود ہمارے ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ اگر کوئی آنکھ سورج سے اونچی جا کر زمین کو دیکھے تو اس کے سامنے ہر وقت دن ہی دن رہے گا۔ رات کبھی نہیں آئے گی۔ اس لئے اس کے نزدیک امروز و فردا کا امتیاز بھی باقی نہیں رہیگا۔ لہٰذا جوں جوں انسان بلندیوں پر پہنچتا جائے تعینات کے پردے اٹھتے جاتے ہیں۔ لیکن وقت کے اس

لامتناہی دریا میں واقعات کے حباب ذہنِ انسانی پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انہی نقوش سے انسانی زندگی ترتیب پاتی ہے۔ گذشتہ چھ سال کے حوادث و کوائف پر ایک نگۂ بازگشت ڈالو اور پھر سوچو کہ وہ جو اُس مردِ قلندرؒ نے، کہ جسے بصیرتِ فرقانی نے منجانب فراستِ عطا کی تھی، کہا تھا کہ

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

کس قدر مبنی بر حقیقت تھا۔ اس چھ سال کے عرصہ میں دیکھو کہ کس قدر تابناک و درخشندہ تاج ہیں جو فضا میں اڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیسی کیسی عظیم المرتبت سلطنتیں ہیں جو مٹی میں ملتی نظر آ رہی ہیں۔ کیسے کیسے بلند آہنگ دعاوئ تمرد و فرعونیت ہیں جو سربخاک سامنے آ رہے ہیں۔ کس قدر تحیر انگیز انقلابات ہیں جو سینما کی تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ جو واقعات و حوادث پہلے کہیں صدیوں میں بھی تکمیل پذیر نہ ہوا کرتے تھے، اب کس طرح دنوں بلکہ گھنٹوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ اس "عصرِ رفتار" (age of speed) نے وقت کے پہیوں میں بھی بجلیاں بھر دی ہیں۔ اس چھ سال کے عرصہ کو دیکھو اور ان تنے انقلابات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بقول تمہارے محبوب "خیامِ ہندی" کے۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

اور پھر اس دوربین کو آنکھوں سے الگ کر کے، ذرا اپنے قریب کی دنیا کو دیکھو۔ وہ "خواب" جو اُسی مردِ داناؒ نے جس کا ذکر ابھی ابھی وجہ نشاطِ روح ہو چکا ہے، ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا اور جس کا استقبال ہر ایک نے تبسم زیرِ لبی سے کیا تھا کہ اُن کے نزدیک یہ "شاعرانہ تخیل" اسی سلوک کا مستحق تھا۔ ہاں وہی "خواب" کس طرح محسوس پیکروں میں ہمارے سامنے آگیا ۔۔۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ یہ "خوابِ شیریں" ہماری شامتِ اعمال سے، کس طرح اپنے ساتھ "تیشۂ فرہاد" لیکر آیا کہ جس نے ہمارے اثاثِ قومی کے ہر کاخ و کو اور متاعِ ملی کے ہر در و دیوار کو اس طرح تودۂ خاک بنا کر رکھ دیا کان لم یکن شیئاً مذکوراً۔ سلیم! یہ قیامتیں کہیں باہر سے ہم پر نہیں ٹوٹیں۔ خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تھیں۔ [وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک]۔ لیکن سلیم! اس حدیثِ جگر پاش و داستانِ سینہ سوز کو اس وقت نہ چھیڑو ورنہ تمہارے سوالات کا جواب رہ جائے گا جو میرے بربطِ ہستی کے ان تاروں کے قریب مضراب

مت لاؤ کہ ان میں شعلے نہیں، آگ بھری ہے۔ میں آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر دہک رہا ہوں۔ میرے سینۂ سوزاں کو بند ہی رہنے دو کہ اگر اسے کسی طرف سے بھی ہوا لگ گئی تو یہ آگ شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھے گی۔ لہٰذا سلیم! مجھے رُکنے دو تاکہ تمہارے شبہات کا ازالہ کر سکوں۔ غور سے سنو کہ بات بڑی اہم ہے۔

تم پوچھتے ہو کہ میں نے "وراثتِ ارض کے ابدی قانون" کے سلسلہ میں "صلاحیت" اور "صالحیت" میں جو فرق بتایا ہے اس کی لِم اور تفصیل کیا ہے! اگرچہ تم نے "وضاحت سے نہیں لکھا لیکن اس باب میں جو مشکل تمہارے سینے میں پھانس بن کر کھٹک رہی ہے مجھے اس کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ یہ خلش کچھ تم ہی سے مخصوص نہیں۔ آج قریب قریب ساری دنیا اسی الجھاؤ میں نظر آ رہی ہے۔ تمہارے متعلق یہ امر میرے لئے ہمیشہ باعثِ حسرت رہا ہے کہ تم اپنی کھٹک کو بلا تامل کہہ ڈالتے ہو۔ یاد رکھو حقیقی اطمینان اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان دل میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات کو واضح طور پر بیان کر دے اور جب تک وہ بالکل صاف نہ ہو جائیں، پیچھا نہ چھوڑے۔ "حقیقی اطمینان" کے الفاظ میں "حقیقی" کو خاص طور پر ملحوظ رکھو۔ اس لئے کہ "جھوٹے" اطمینان کی دنیا میں بہت سی شکلیں ہیں۔ لیکن اطمینان وہی اطمینان ہے جو حقیقی ہو اور یہی ایمان کی اساس ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھوڑی دور پیچھے جانا پڑے گا۔

(۱) ایک شخص سنکھیا کھا لیتا ہے۔ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعی زندگی ایک خاص نظام اور خاص قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس نظام اور ان قوانین طبیعی (Physical laws) نے سنکھیا کو مہلک بتایا ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی جسم پر ایک ایسا اثر مرتب کرتا ہے جو قاطعِ زندگی ہے۔ اس لئے سنکھیا کھانے والے کی موت یقینی ہے۔ یہ قوانینِ فطرت کا تقاضا ہے اور اس کا ثبوت بدیہی۔

(۲) ایک شخص گھی کھاتا ہے۔ گھی مُمِدِّ حیات ہے اس لئے اس سے اس میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اور توانائی سے زندگی کا قیام ہے۔

(۳) ایک شخص گھی خرید کر لاتا ہے۔ دوسرا شخص چرا کر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں پر گھی کا اثر

یکساں ہوگا یا مختلف۔ قوانینِ طبیعی کا جواب صاف اور واضح ہے کہ گھی کے اثر پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ گھی دونوں صورتوں میں توانائی بخش اور ممدِ حیات ثابت ہوگا۔ اس سے ہر حالت میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۴) مغرب کی مادی (میکانکی) تہذیب چونکہ قوانینِ طبیعی سے ماوراء کسی اور نظامِ قوانین کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے اس کے نزدیک جو شے ممدِ حیات اور تقویت بخش ہے (یعنی انسان۔ یا اس سے آگے بڑھئے تو انسانوں کے مجموعہ یعنی قوم۔ میں زندگی کی صلاحیت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے) وہ نفع رساں ہے اور چونکہ کسی شے کے اچھے یا برے ہونے کا معیار لامحالہ یہی ہے کہ وہ نفع رساں ہے یا نقصان دہ۔ اس لئے ذریعۂ حصول کو اس فیصلہ میں کوئی دخل نہیں۔ گھی اچھی چیز ہے خواہ کسی طریق سے حاصل کیا جائے۔ سنکھیا بری چیز ہے خواہ ذریعۂ حصول کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) تم یہ کہو گے کہ اہلِ مغرب جب چوری کو معیوب قرار دیتے ہیں اور قانون کی رُو سے جرم۔ تو وہ لامحالہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "چوری کا گھی" بری چیز ہے اور "خریدا ہوا گھی" اچھی چیز۔

لیکن ہم نے ابھی ابھی اوپر دیکھا ہے کہ قوانینِ طبیعی کی رُو سے گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے خواہ وہ مسروقہ ہو یا خرید کردہ۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ مادی تہذیب کی رُو سے چوری کا گھی اور نتیجہ پیدا کرتا ہے اور خرید کردہ اور۔ لہٰذا بات زیادہ سے زیادہ یوں ہوئی کہ

(ا) گھی بہرحال اچھی چیز ہے،

(ب) چوری بری چیز ہے۔

شق (ب) یعنی "چوری بری چیز ہے" قوانینِ طبیعی سے متعلق نہیں ضابطۂ اخلاق (Code of Ethics) سے متعلق ہے۔

لیکن جب انسان کی زندگی صرف قوانینِ طبیعی کے ماتحت ہے تو پھر یہ ضابطۂ اخلاق کیا ہے؟ زید چوری، ڈاکہ، دھوکا، فریب سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے اسلحہ خریدتا ہے۔ اپنے گرد ایک جماعت پیدا کر لیتا ہے۔ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے متوسلین کو بھی آسائش و راحت کے سامان

فراہم کرکے دیتا ہے۔ دوسری طرف عمرؓ صبح سے شام تک محنت کرتا ہے، بڑی مشکل سے چار پیسے حاصل کرتا ہے۔ عمر بھر عسرت سے دن پورے کرتا ہے۔ زندگی بڑی تنگی سے گذارتا ہے۔ زید بھی مرجاتا ہے۔ عمر بھی۔ دونوں کا معاملہ (قوانینِ طبیعی کی رُو سے) ختم ہوجاتا ہے۔ ضابطۂ اخلاق کی پابندی نے عمرؓ کو کیا دیدیا اور اس کی شکست و ریخت نے زید کا کیا بگاڑ دیا؟ لہٰذا ضابطۂ اخلاق سے فائدہ کیا ہے!

مغرب کا معلمِ اخلاق یہ جواب دیتا ہے کہ ضابطۂ اخلاق سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے۔ یعنی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں (وہی ہربرٹ اسپنسر سلیم! جس کے "First principles" کے کبھی تم بہت دلدادہ ہوا کرتے تھے)۔ ہاں اسی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں۔ اخلاق خوفِ انتقام (Fear for Revenge) کی پیدا کردہ چیز ہے۔ یعنی میں چوری اس لئے نہیں کرتا کہ ڈرتا ہوں کہ اگر اسے معیوب نہ قرار دیا گیا تو میری بھی کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکے گی۔ میں کسی کو فریب اس لئے نہیں دیتا کہ مجھے خوف ہے کہ اگر اس پر پابندی نہ لگائی گئی تو مجھ سے زیادہ شاطر دعیار مجھے فریب دے جائے گا۔ لہٰذا اخلاقیات کی ذاتی طور پر کچھ قیمت نہیں۔ یہ نظامِ سوسائٹی کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کی بنیاد خوفِ انتقام اور پولیس، عدالت، جیل، سب اسی جذبۂ خوف کو برقرار رکھنے کے ذرائع۔

اس کا مطلب، سلیم یہ ہوا کہ اگر میں ایسا انتظام کرلوں کہ مجھے خوفِ انتقام نہ رہے۔ یعنی میں کسی پولیس والے کے قابو نہ آسکوں۔ اور اگر قابو آبھی جاؤں تو عدالت پر اثر ڈال لوں۔ یا اتنی طاقت حاصل کرلوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے یارائے انتقام ہی نہ رہے۔ تو پھر میرے لئے اخلاق کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب یورپ میں ہو کیا رہا ہے! وہاں اب "ذہنوں کی جنگ" (Battle of wits) ہورہی ہے، ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میں ایسا انتظام کرلوں کہ دوسرے کو دھوکا دے جاؤں لیکن اُسے پتہ نہ چلے۔ جرم کرجاؤں لیکن پکڑا نہ جاؤں۔

لیکن اس صورت میں پھر بھی جرم کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے ذرا اور آگے بڑھو۔ اگر کوئی سوسائٹی یہ فیصلہ کردے کہ اپنے قبیلہ یا اپنی قوم میں چوری کرنا، فریب دینا، جرم ہے، لیکن دوسرے قبیلہ یا دوسری قوم کے ساتھ یہ سب کچھ روا ہے۔ تو پھر ان افعال میں جرم کا احساس بھی نہیں رہے گا۔ قدیم رومیوں میں

یہی قانون تھا کہ غیر رومیوں کے ہاں چوری کر لینا معیوب نہیں۔ اس کی تقلید یورپ کی نیشنلزم نے کی ہے۔ ہر وہ کام جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچتی ہے۔ حب الوطنی (Patriotism) کا جوہر لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا درخورِ ستائش۔ اب وہی جنگِ عقول (Battle of wits) جو ایک قوم کے افراد میں باہم گرم تھی۔ مختلف اقوامِ عالم میں سرگرمِ عمل ہے۔ اب ہر قوم دوسری اقوام کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ کرنا اس کو فقط اتنا ہوتا ہے، کہ اتنی قوت فراہم کر لے کہ اُسے "خوفِ انتقام" نہ رہے۔ اسی کا نام ان کے ہاں صلاحیت ہے۔ یعنی ان کے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اس قوم میں ہے جو خوفِ انتقام سے مامون ہو جائے اور پھر جو کچھ جی میں آئے کرے۔

یہ ہے سلیم! ماحصل مغرب کی مادی (یا میکانکی) تہذیب کا، اور یہ ہے مفہوم صلاحیت کا۔ یعنی گھی بہر نوع توانائی بخش ہے۔ خواہ خرید کر لو، خواہ چرا کر۔

اور چوری کرو تو اس اہتمام کے ساتھ کہ تمہیں خوفِ انتقام نہ رہے۔

اگر تم نے ایسا کر لیا تو ہر روز چوری کا گھی کھاؤ۔ تم میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

یہ ایک نہج فکر ہے۔ دوسری طرف ایک اور اسلوبِ فکر ہے، جس کی دعوت اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن زندگی صرف طبیعی ہی نہیں اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ طبیعی زندگی حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن مقامِ انسانیت، سطحِ حیوانیت سے ایک درجہ آگے ہے۔ انسانی زندگی کی اس خصوصیت کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ غرض نام سے نہیں۔ اُس حقیقت سے ہے جس کا تعارف اس نام سے کرایا جائے۔ مقامِ انسانیت کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو قوانینِ طبیعی کے تابع نہیں ہیں۔ اسلئے اس کا سلسلہ بھی سانس کی آمد و رفت تک محدود نہیں۔ تارِ نفس کے ٹوٹنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہ وہ شے ہے جسے سلیم! میں شرفِ انسانیت کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ جسے حضرت علامہ (اقبالؒ) خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تم اسے روح کہہ لو۔ جس طرح انسان کے جسمانی قویٰ کی پرورش اور تعمیر ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے، اسی طرح اس شے دیگر (شرفِ انسانیت یا خودی) کی تربیت و بالندگی بھی ایک خاص

ضابطۂ آئین کے تابع ہوتی ہے۔ اس امتیاز کے ماتحت "گمی" اور "مسروقہ" دو الگ الگ چیزیں ہوجاتی ہیں۔ گمی اپنا نتیجہ قانونِ طبیعی کے مطابق مرتب کرتا ہے۔ "مسروقہ" اپنا نتیجہ اس دوسرے قانون کی رُو سے متشکل کرتا ہے۔ اس قانون کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جو جہانِ مشیت سے متعلق ہے۔ خدا کی ذات ان دونوں نظامہائے قوانین (قوانینِ فطرت اور قوانینِ مشیت) کی نگران ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قانونِ فطرت یہ دیکھتا ہے کہ گمی کا نتیجہ جسمِ انسان کے لئے قوت بخش ہونا چاہئے وہاں اس کا قانونِ مکافات اس پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ "مسروقہ" کا نتیجہ زوالِ شرفِ انسانیت یا ضعفِ خودی ہونا چاہئے۔ اور چونکہ یہ ضوابطِ قوانین اٹل ہیں اس لئے ان کے نتائج بھی اٹل ہیں۔ قوانینِ فطرت کے مطابق عمدہ نتائج کا ماحصل صلاحیت ہے اور قوانینِ مکافات کے مطابق عملِ خیر کا ماحصل صالحیت۔ قرآن ان دونوں ضوابط قوانین کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صالحیت میں صلاحیت بھی خود بخود آجاتی ہے۔ لیکن فکرِ مغرب کی صلاحیت میں صالحیت نہیں آتی۔ سمجھے سلیم!

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صالحیت سے نظامِ سوسائٹی خود بخود صحیح خطوط پر قائم رہے گا۔ لہٰذا وہ ضابطۂ اخلاق جسے معلمینِ اخلاق نے نظامِ سوسائٹی کے قیام کی خاطر وضع (یا اختیار) کیا تھا، اس نظامِ مکافاتِ عمل کا ایک طبعی نتیجہ (Natural Corollary) ہوگیا۔ مقصود بالذات نہ رہا۔ قرآن کا نظام، نظامِ معاشرہ کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے اور ارتقائے شرفِ انسانیت کی منازل طے کراتا ہوا، انسانی خودی کو اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا "نظامِ سوسائٹی کا قیام" اس سفر میں سنگِ میل یا چراغِ راہ بن کر رہ جاتا ہے۔ منزلِ مقصود اس سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ یعنی یہ اس "تجارتِ عظمیٰ" کا ضمنی (By-Product) ہوتا ہے۔[1]

---

[1] اس مقام پر سلیم! ایک اور چیز کی طرف بھی غور کرتے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ ہمارے ہاں جب قرآنی اوامر و نواہی کی حقانیت پر بحث کی جاتی ہے تو سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کی پابندی سے سوسائٹی کا نظام بہترین انداز سے چل سکتا ہے۔ اور مقطع میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے بہتر نظامِ سوسائٹی مرتب ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا نظامِ قرآنی سے مقصود سوسائٹی کے نظام کو بہترین خطوط پر متشکل کرنا ہے۔ اور بس۔ یعنی جو چیز اس نظام کی ضمنی (By-Product) ہے۔ ان کے نزدیک وہ ایک اصل مقصود ہے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

سوسائٹی کا نظام، ہر ایسے ضابطہ کی رُو سے چل سکتا ہے جسے افرادِ سوسائٹی متفقہ طور پر تسلیم کر لیں۔ اس لئے اس نظام کو چلانے والے ضابطہ کی کوئی مستقل ذاتی قدر (intrinsic value) نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی سوسائٹی متفقہ طور پر طے کر لے کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے لئے مناکحت کی ضرورت نہیں۔ یہ خالص طبعی جذبہ ہے جس کی تسکین باہمی رضامندی سے ہر جگہ کی جا سکتی ہے۔ باقی رہے اس تسکینِ جذبات کے نتائج (یعنی اولاد) تو ان کی پرورش و تربیت کا انتظام خود سوسائٹی (حکومت) کی طرف سے ہو جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کا یہ نظام بھی چل جائے گا۔ اس صورت میں، اس سوسائٹی کے ضابطۂ اخلاق میں زنا کا لفظ تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض نظامِ سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لئے جو ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے گا اس کی ذاتی حیثیت (intrinsic value) کچھ نہیں ہو گی۔ اگر ایک وقت میں مناکحتِ اخلاقِ حسنہ کا جزو قرار پائے گی تو دوسرے وقت بے باکانہ تسکینِ جذبات ہی حیثیت اختیار کر لیگی۔ مثال کے طور پر آج دنیائے اقتصادیات میں ربوٰا (سود) کو نظامِ سوسائٹی نے متفقہ طور پر جائز تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا یہ نہ ان کے ضابطۂ اخلاق کی رُو سے معیوب ہے، نہ کسی قانون کی رو سے جرم۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فکرِ مغرب کی رو سے ربوٰا (سود) فی ذاتہٖ نہ معیوب ہے نہ مستحسن۔ اگر سوسائٹی اپنے نظام کے قیام کے لئے اسے متفقہ طور پر معیوب قرار دیدے تو یہ معیوب ہو جائے گا اور اگر متفقہ طور پر اسے اختیار کر لے تو یہ مستحسن قرار پا جائے گا۔ (جس طرح یورپ میں بائیں طرف چلنا قانونِ راہ روی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا) لہٰذا مغربی نہج فکر کے مطابق ضوابطِ اخلاق کے اجزا اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں رکھتے۔ جس چیز کو معاشرہ متفقہ طور پر اختیار کر لے وہ مستحسن (اور جو اس کے خلاف کرے وہ مجرم) اور جس شے کو وہ متفقہ طور پر رد کر دے، وہ معیوب (اور اس سے

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس نظام میں سوسائٹی کا نظام بہترین خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اس نظام کا آخری نتیجہ نہیں۔ یہ نظام انسان میں وہ صالحیت پیدا کرتا ہے جس سے یہ شرفِ انسانیت کی بلند منازل طے کرتا ہوا اپنے اندر اس زندگی سے اگلی زندگی کی سرفرازیوں کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ یہ ہے اس نظام کا مقصود۔ اسی لئے قرآنی نظام کو ہمیشہ اس حیثیت سے دیکھنا اور اسی حیثیت سے پیش کرنا چاہئے۔ اسی سے تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ ایمان بالآخرت کا مفہوم اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ ان امور کی وضاحت تمہیں معارف القرآن میں ملے گی۔ مجھے تمہارے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم اسے محض "ناول" کی طرح نہیں پڑھ رہے۔

اجتناب کرنے والا شریف) لیکن ضابطہ قانونِ مکافات کی رُو سے ہر چیز اپنی ایک مستقل قدر (Value) رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح عالمِ طبیعی میں اشیاء کے خواص، انسانوں کے فیصلوں کی رو سے تبدیل نہیں ہوتے۔ اسی طرح عالمِ مشیت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) میں بھی "اشیاء" کے خواص انسانوں کے فیصلوں کی رو سے نہیں بدلتے۔ مثلاً سنکھیا قاطعِ حیات ہے۔ اگر تمام دنیا کے انسان مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ۔ آج سے ہم سنکھیا کو مدحیات سمجھیں گے تو اس فیصلہ سے سنکھیا پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ وہ حق ہے (یعنی اپنی خاصیت میں اٹل) اس لئے وہ "اکثریت" کی رائے کے تابع نہیں چلتا۔ اسی طرح، ربوا (یا مثلاً جھوٹ) قاطعِ شرفِ انسانیت ہے۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی فیصلہ کر دیں کہ آج سے ہم ربوا (یا جھوٹ) کو ممدِ نظامِ سوسائٹی قرار دیں گے تو وہ اپنی تاثیر کو نہیں بدل دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قاطعِ شرفِ انسانیت ہونا بھی حق ہے اور حق انسانوں کے فیصلوں کے تابع نہیں چلا کرتا۔ ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیھن۔ اگر حق لوگوں کے خیالات کے تابع چلنے لگ جائے تو تمام کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ پھر جس طرح سنکھیا کو اپنی تاثیر مرتب کرنے کے لئے ایک مستقل نظامِ طبیعی کی ضرورت ہے۔ جسمانی نظام میں نہ معلوم کیسے کیسے عظیم اور لطیف تغیرات رونما ہوتے ہیں، تب کہیں جا کر سنکھیا کی سمیت منتج بہ ہلاکت ہوتی ہے یا گھی، جسمانی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کو اپنا ہلاکت انگیز یا صداقت انسانیت پرور نتیجہ مرتب کرنے کے لئے بھی ایک عظیم الشان نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہے کہ اس میں نگاہ کی خفیف سی جنبش اور دل کی ہلکی سی لرزش تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ اسی حقیقتِ غیر متبدلہ کا اعتراف اللہ پر ایمان کہلاتا ہے۔ مغرب کے علمائے فطرت، نظامِ قوانینِ طبیعی کو اٹل مانتے ہیں لیکن وہ اسے بالعموم اندھی فطرت کا میکانکی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک بلند و بالا ہستی کا چلایا ہوا ہے اور اس طرح وہ خدا کی ہستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سلیم! غور کرو کہ خدا پر اس قسم کے ایمان کا کچھ نتیجہ بھی ہوتا ہے؟ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ چاند، سورج، ستارے، زمین، سب اتفاقی طور پر گردش کے سلسلۂ طبیعی میں جکڑے ہوئے ہیں اور میکانکی عمل سے رواں دواں ہیں۔ اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں۔ انہیں

خدا نے بنایا ہے اور یہ اُسی کے قائم کردہ نظام کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ کہئے کہ جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے، اول الذکر کے انکار سے کیا زیاں ہوتا ہے جو ثانی الذکر کے اقرار سے پورا ہو جاتا ہے! زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ثانی الذکر نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن وہ بات بسلیم! اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس اقرارِ حقیقت سے دنیائے انسانیت میں کیا فرق پڑتا ہے۔ خدا پر حقیقی ایمان شروع ہی اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ اس کے نظام میں انسان کا کوئی عمل اور کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اور نہ کبھی غلط نتیجہ ہی مرتب کر سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں متعدد بار آیا ہے کہ ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰت والارض وسخر الشمس والقمر۔ اگر تو ان سے پوچھے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے۔ لیقولن اللہ۔ یہ اقرار کریں گے کہ اللہ نے۔ یعنی وہی ایمان جو مغرب کے علمائے فطرت میں سے خدا کو ماننے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس اعتراف کے باوجود یہ الٹی الٹی راہیں چلتے ہیں (فانی یؤفکون۔ ۲۹/۶۱) تو یہ اس لئے کہ ان کا ایمان فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر ہوتا ہے، نظامِ مکافاتِ عمل کے خدا پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا مغرب کی میکانکی تہذیب میں

(i) یا تو خدا کی ہستی سے کلیۃً انکار ہی ہوتا ہے۔

(ii) اور اگر کہیں اقرار بھی ہوتا ہے تو فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر۔

(iii) اس کے بعد وہ نظامِ معاشرت (سوسائٹی) کے قیام کے لئے خود قاعدے مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی کو ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں۔ جس کی حیثیت فقط اتنی ہوتی ہے کہ انسانوں نے متفقہ طور پر اس ضابطہ کو اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ جیسے یورپ میں سڑک کے بائیں طرف چلنا، قانونِ راہ روی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا۔

(iv) اور ان ضوابط پر پابندی کا محرک جذبہ، خوفِ انتقام یا مواخذۂ قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایسا خوف سے مامونیت کا انتظام کر لے تو پھر اسے اس پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔

(v) اس نظام کی پابندی سے جماعتی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو تسخیرِ قوائے فطرت کے ساتھ مل کر اس قوم میں طبیعی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

(ا) اور چونکہ زندگی ان کے نزدیک فقط یہی طبیعی زندگی ہے اس لئے جس طریق سے یہ صلاحیت حاصل ہو جائے وہی طریق مستحسن قرار پاتا ہے۔

اس کے برعکس اس دوسری تہذیب کی رو سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(ل) نظام طبیعی کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے جسے نظامِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس نظام میں ہر عمل کا ایک نتیجہ متعین ہوتا ہے۔ اور کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اعمال کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جس سے شرفِ انسانیت (انسانی خودی) کی نشوونما اور بالیدگی و بہرہ مندی ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس سے اس میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) نظام طبیعی کی پابندیوں سے طبیعی زندگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس نظامِ مکافاتِ عمل کے اتباع سے انسانی زندگی میں صالحیت پیدا ہوتی ہے۔

(ج) "صالحیت" میں "صلاحیت" خود بخود آجاتی ہے لیکن صرف "صلاحیت" میں "صالحیت" نہیں آسکتی۔

اس سے سلیم! ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ

(۱) مغرب کے میکانکی نظام میں طبیعی زندگی کی صلاحیت مقصود ہے۔

(۲) قرآن کے نظام ایمان و عمل میں طبیعی زندگی کی صلاحیت کے ساتھ ماورائے حیاتِ طبیعی کی صالحیت بھی آجاتی ہے۔ اور

(۳) عجمی اسلام کے نظامِ تنویم میں نہ صلاحیت ہوتی ہے نہ صالحیت۔ خسر الدنیا والآخرۃ ذالک خسران المبین۔

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

کیوں سلیم! ملا جواب تمہارے سوال کا؟ سمجھ گئے فرق صلاحیت اور صالحیت میں؟ اب آگیا تمہارے ذہن میں کہ جو وراثتِ ارض خدا کی طرف سے ملتی ہے، وہ مشروط بصالحیت ہوتی ہے۔ لیکن جو حکومت و سلطنت فقط صلاحیت (مادی قوت) کا نتیجہ ہوتی ہے وہ ابلیسی نظام کی عطا کردہ ہوتی ہے، اور جس میں وہ ملتی ہے نہ یہ۔ وہ ہم ہندی مسلمانوں کا عجمی اسلام ہے۔

میں نے سلیم! اس خط میں دانستہ اس بات کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ (۱) طبیعی زندگی کے علاوہ انسانی زندگی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ (۱۱) قوانینِ فطرت کے علاوہ، قوانینِ مکافاتِ عمل بھی ہیں۔ (۱۱۱) ان قوانین کی رو سے اعمال کے نتائج متعین اور ان کی اقدار (Values) مستقل ہیں۔ میں ان چیزوں کو بطور حقیقتِ ثابتہ بیان کر گیا ہوں۔ علمی طور پر انہیں پیش نہیں کیا۔ میں نے اس وقت دانستہ اس بحث کو نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس سے بات، تمہارے سوال سے بہت دور نکل جاتی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ان چیزوں کو محض عقیدۃً نہیں مان رکھا۔ علی وجہ البصیرت مانا ہے۔ اس لئے انہیں علی وجہ البصیرت سمجھا بھی سکتا ہوں۔ لیکن اسے کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھو۔ سردست اگر تم انہی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لو جو اس خط میں سامنے آگئی ہیں تو مجھے امید ہے کہ تمہارے بہت سے الجھاؤ اس سے دور ہو جائیں گے۔ امید اس لئے ہے کہ تمہارا قلب سلیم ہے اور سعادت و ہدایت کی راہیں اُسی کے لئے کشادہ ہوتی ہیں من اتی اللہ بقلب سلیم۔ جو اللہ کی طرف قلبِ سلیم لیکر آئے۔ عم مرحوم نے سلیم! تمہارا نام بھی کس قدر تمہاری فطرت کے عین مطابق رکھا ہے۔ تم بڑے ہی خوش بخت ہو۔ اچھا۔ خدا حافظ

دعاگو

پرویز

طلوعِ اسلام پر ایک نظر

طلوعِ اسلام خود ستائی کا روادار نہیں اور یہ گرامی نامے اس اعتبار سے ان صفحات میں جگہ حاصل نہ کرتے ــــ گو ہم انھیں کہیں بہتر جگہ یعنی اپنے دل میں محفوظ رکھتے ــــ لیکن بعض کرم فرماؤں کے جذبات بعض اوقات مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کے سامنے ان اصولوں کی سپر ڈال دی جائے۔

(۱) یہ امر انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ "طلوعِ اسلام" مطلع کراچی سے طالع ہونے میں بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب ہو گیا ہے۔ اگر ماضی کے آئینے میں مستقبل کے خدوخال کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور کسی کی گذری ہوئی زندگی سے اس کی آئندہ سمتِ سفر معلوم کی جا سکتی ہے اور گلستاں کو دیکھ کر ہی اس کی بہار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تو مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ طلوعِ اسلام کا مستقبل اس کے ماضی سے کہیں زیادہ شاندار، ممتاز اور کامیاب ثابت ہوگا۔ میں نے طلوعِ اسلام کا پہلا ایشوع اول سے آخر تک بغور مطالعہ کیا ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد ملتِ اسلامیہ کے سامنے جو اہم نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر مجھے طلوعِ اسلام کے صفحات میں جس چیز کی تلاش اور تجسس تھی، بحمداللہ مجھے اس کا نشان مل گیا ہے۔ ویسے تو ادبی، سیاسی اور علمی حیثیت سے طلوعِ اسلام کے جملہ مضامین علی العموم بہت بلند ہیں۔ لیکن جہاں تک تشخیصِ مرض اور اس کے صحیح علاج کا تعلق ہے، تو ضروری ہے کہ طبیبِ کامل مریض کا مرض معلوم کرنے کے بعد اس کے لئے نسخۂ شفا ر تجویز کرے، اور اس کو زحمتِ انتظار سے بچائے۔ طلوعِ اسلام نے "پس چہ باید کرد" اور "لمعات" میں انہی اصول کے ماتحت ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کی ہے۔ پہلے عنوان کے تحت میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ نئے احوال

میں ملتِ اسلامیہ کے مقاصد و واجبات کیا ہیں۔ اور ہمارے حکام اور عوام کو کیا کرنا چاہیئے؟ ویسے تو ان مقاصد کو نو اجزاء تک پھیلایا گیا ہے۔ لیکن جامعیت اور ایجاز کی زبان میں دیکھنا ہو تو ان نو اجزاء کے آخری دو جزء ان تمام مقاصد کو جامع اور محیط ہیں۔ آٹھویں جزء میں کہا گیا ہے کہ

"جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہیں گے۔

اس جزء کا مختصر مقصد تحفظ و دفاع و استحکام پاکستان ہے۔ اور معلوم ہے کہ اس وقت ملتِ اسلامیہ کا سب سے اہم اور بنیادی مقصد یہی ہے اور یہی ہونا چاہیئے۔

نویں جزء میں مرقوم ہے کہ

اور ان سب مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑا ہم نے حاصل کیا ہے یا بالفاظِ صحیح ہمیں اس مبدءِ فیض و کرم کی موہبتِ کبریٰ سے عنایت ہوا ہے وہ غرض بطریق احسن پوری ہو جائے۔ اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطۂ ارض میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر فطری غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے۔ اور اس طرح پھر سے اس آئینِ کہن کو تازہ کر دے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے ع یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔

ان دونوں مقاصد میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو اس وقت ملتِ اسلامیہ کے مرکزِ توجہ اور مرکزِ نظر ہے اور جنہیں "مقاصدِ تسعہ" یعنی نو اجزاء میں پھیلایا گیا ہے ع

سمٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

یہاں تک تو ملتِ اسلامیہ کے لئے سمتِ سفر اور منزلِ مقصود متعین کی گئی۔ اور انھیں بتایا گیا کہ حصولِ پاکستان سے ان کی منزل ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ اصلی منزل تو ابھی باقی ہے جس تک پہنچنے کے لئے کاروانِ ملتِ اسلامیہ کو جادہ پیما ہونا چاہیئے، سو اگر طلوعِ اسلام بس اسی پر اکتفا کرتا۔ اور کاروانِ ملت کو جادہ پیما ہونے کی تلقین کر کے خود جادہ پیما نہ ہو جاتا۔ تو طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے ایک عازمِ سفر محقق کی تسکین

ہرگز نہ ہو سکتی۔ لیکن بحمداللہ ہم "لمعات" میں دیکھ رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام وقفِ انتظار نہیں۔ بلکہ اس نے منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھا دیا ہے اور وہ یہ کہ طلوعِ اسلام کو پاکستان کی دولتی پالیسی پر حرفِ مخلصانہ اور تعمیری تنقید کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ بچ گیا یا نہیں، اور اس حق گوئی کو میں طلوعِ اسلام کا منزلِ مقصود کی طرف جادہ پیما اور گامزن ہونا سمجھتا ہوں۔ اور یہی چیز ہے جو نہ صرف میرے لئے بلکہ طلوعِ اسلام کے تمام مخلص قارئین کرام کے لئے موجبِ ایقان اور وجہِ تسکین ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ "لمعات" میں طلوعِ اسلام نے آل انڈیا مسلم لیگ کے دو حصوں میں تقسیم ہونے اور ہندوستان کی مسلم اقلیت اور پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی ترجمانی کا صحیح آئینہ دار ہے۔ "لمعات" کا یہ لمعہ ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں جیسا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا ہے۔ اس وقت پاکستانی مسلمان کا ذہن اس چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ غیر مسلم بھی اس کی قوم کا جزو بن سکتے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کے مسلمان نے مسلسل دس برس تک اس ایک سوال پر ہندو اور انگریز سے جنگ لڑی ہے اور اس بنیادی فرق کی بنا پر دنیا سے جداگانہ حقِ استقلال منوایا ہے اس لئے ابھی اس کا ذہن اس نظریۂ قومیت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی قومیت سے الگ کر کے اپنی قومیت کے دائرہ کو محض پاکستانی حدود یا وحدتِ حکومت کے نظریہ پر قائم کر لیا۔ تو رفتہ رفتہ اول الذکر نظریہ ذہن سے اوجھل ہو جائے گا اور بنا بر وحدتِ حکومت یا وحدتِ وطن پاکستان کا مسلمان یہاں کے غیر مسلم کو اپنا ہم قوم سمجھنے میں کچھ بھی تردد محسوس نہیں کرے گا۔ ہمارا آج کا اسلام چودہ سو سال پیشتر کے حقیقی اسلام سے اسی صورت میں مختلف ہوا ہے کہ جب کوئی بات ابتداءً اپنے مرکز سے سرکی، تو ہم نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اور رفتہ رفتہ تھوڑے عرصے کے بعد اس نے اصل شے کی جگہ اختیار کر لی اور یوں ہوا

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اور یہی خطرہ ہمیں اس باب میں محسوس ہو رہا ہے۔

آگے چل کر ہندوستانی مسلمان کی حفاظت اور اس کی ذمہ داری کے متعلق لکھا ہے

اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان کی تفریق پیدا ہی کیوں کی جائے۔ یہ یہاں کے دس کروڑ مسلمانوں کا مشترک مسئلہ ہے اور اگر پاکستان کا مسلمان اسے اپنا مسئلہ نہیں سمجھتا اور یہ خیال کر کے مطمئن ہو جانا چاہتا ہے کہ جس کے سر پڑی ہے وہی بھگتے گا۔ مجھے میرے پاکستان سے واسطہ ہونا چاہیے۔ تو قسم ہے اس خدائے ذوالجلال کے قانونِ مکافاتِ عمل کی جس کی موہبتِ عظمیٰ نے پاکستان کا خطۂ زمین انعام فرمایا ہے کہ دنیا اور عاقبت دونوں کی روسیاہی اور ذلت و خرابی لیے مسلمان کے سر منڈلا رہی ہے۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

"طلوعِ اسلام" کے ان بلند اسلامی و ملی مقاصد و عزائم کو دیکھ کر ہر فہمیدہ مخلص اور درد دل رکھنے والے مسلمان کے دل میں اس کے لئے قدر و محبت کا جذبہ پیدا ہونا اور اس کے ساتھ متفق و مؤید ہونا ناگزیر امر ہے۔ طلوعِ اسلام کی یہ آواز سرحد کے غیور نوجوانانِ اسلام اور فرزندانِ توحید کے دل کی آواز ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ طلوعِ اسلام کو اپنے مقاصدِ جلیلہ میں کما حقہ کامیاب فرمائے اور ملتِ اسلامیہ کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں مدد دے۔

ع وَیَرْحَمُ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ اٰمِیْنَا

مدار اللہ مردانی عفی عنہ

سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء صوبہ سرحد مردان

---

(۲) یوپی کے ایک "مرغِ رشتہ بریا" کی نوائے سوز جو ہمیں "کبوترِ بامِ حرم" سمجھتا ہے!

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دینِ مبیں کا مجلہ یا مرقع تاثراتِ روحی سامنے آیا۔ آفتابِ سعادت کی ہر شعاع، سحرِ ایمان کا پیغام، طلوعِ سحر کی ہر نوا، بانگ درا۔ انتہائی ادبی دلنوازیوں کے ساتھ عبرت و بصیرت کے دریا، کوثر و تسنیم کی

نہریں جاری ہیں، خدا کرے کہ یہ ایمانیات کی بارشیں، ذراتِ حیات کی پیاسیں بڑھائیں اور سفینہ طلب کو جستجوئے ساحل سکھائیں۔ سعیکم مشکورا۔ سچ تو یہ کہ تبصرہ گرامی نے ہزاروں آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے ہیں مگر بظاہر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے کہ یہ چیز اُن سب آنکھوں تک پہنچ جائے گی۔ خیر مقصود تو پیغامِ قرآنی کا پہنچانا ہے۔ کسی نظام کا ہر جزو جب اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا وہ کام جو مقصدِ نظام کے تحت میں کرنا چاہیئے کرنے لگتا ہے تو ہر مشکل خود بخود سہل ہونے لگتی ہے۔ یک دلی اور ہم مشربی اگر غائبانہ کا فی متصور ہو تو دعا ہے کہ آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں مگر یہاں تو یہ حال ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی خود ہماری خبر نہیں آتی

نہ یارائے سکوت، نہ مجالِ گفتگو، نہ کچھ کہا جاتا ہے، نہ سنا جاتا ہے، نہ اجازت ہے، نہ رخصت۔ اگر سب متحد الخیال، متحد العمل بھی ہو جائیں تو پھر گریۂ قطراتِ شبنم، گریہ نہ رہے، بارشِ نیساں بن جائے۔ مگر یہ کیوں ہو، نہ قوتِ پرواز، نہ بال و پر سے بے نیاز۔ کعبہ، قلبِ زمین سہی، مگر ہر ذرۂ حقیر، قلب کو کس طرح پائے، بے سرمایہ تڑپتے رہ گئے، سرمایہ دار حج کر کے واپس بھی آ گئے۔ حاصل یہ ہے کہ مرکزیت دل و دماغ ضروری ہے مگر مواقعات میں کیوں کر حاصل ہو۔

درس نہ دے قرار کا یول دلِ بیقرار کو جلووں کے ماسوا بھی کچھ چاہیئے اعتبار کو

ذرے آفتاب بن کر ایک ہمہ گیر پیغامِ سحر دے سکتے ہیں مگر شرط مرکزِ واحد پر جمع ہو جانا ہے، تحریک مبارک ہے، کاش کہ کبھی سب ایسے منتشر عناصر کسی طرح متحد ہو کر شایانِ مقصد کام کر سکیں۔ مرکز اس لئے مانگتے ہیں کہ شیرازۂ نظام قائم ہو، اور نظام اسی لئے عزیز ہوتا ہے کہ بغیر نظام زندگی کا خیال، محال۔ خدا کرے کہ یہ خواب اپنی صحیح تعبیر پائے۔ آرزوؤں نے دیکھا ہے کہ ذرے پھر سے اپنے آفتاب کی روشنی سے فضاؤں کو منور کر رہے ہیں اور صبحِ سعادت کے انوار سے دامنوں کو بھر رہے ہیں۔

---

(۳) طلوعِ اسلام کی اشاعت مارچ ۱۹۴۸ء کے لمعات میں ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ اُس عام جذبۂ مرعوبیت اور خوشامدانہ طرزِ عمل پر تبصرہ کیا تھا جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں

میں، تقسیم کے بعد، پیدا ہو چکا ہے اور جس کا مظاہرہ انھوں نے خصوصی طور پر جناح گاندھی کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں کیا ہے۔ یو پی کے ایک صاحب نے ہمارے ان خیالات سے شدید اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مکتوب کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

تعارفاً اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ صاحبِ مکتوب اُن معدودے چند بزرگوں میں سے ہیں جو پاکستان پر اعتقاد و ایمان رکھتے تھے اور بدستور اس عقیدہ پر قائم ہیں۔

طلوعِ اسلام ماہِ مارچ ۱۹۴۸ء میں "لمعات" کے زیرِ عنوان ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت دوسرے پیراگراف میں جن خیالات کا آپ نے اظہار فرمایا ہے مجھے ان سے سخت اختلاف ہے۔ میرے نزدیک آپ نے بالکل جذبات کی رو میں یہ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو کچھ گذری ہے اور جن ہولناک حالات سے انھیں گذرنا پڑا ہے وہ انھیں ہی معلوم ہیں جن پر وہ حالات گذرے ہیں۔ آپ کو ان کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

بیشک تملق، چاپلوسی اور مداہنت بُری اور بہت ہی بُری عادتیں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ بری عادتیں آج پیدا نہیں ہو گئیں یہ بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں۔ ہم نے (یعنی ہماری سب سے بڑی نمائندہ جماعت نے) ان بدعادتوں کو دور کرنے کی کوشش کب کی تھی۔ قوم کی سیرت تعمیر نہ کرنا اور حکومت قائم کر بیٹھنا سخت سیاسی غلطی ہے۔ قوم کی سیرت تعمیر کرنا تو درکنار ہم نے تو اپنے ہائی کمانڈ کی بھی سیرت کی تعمیر نہیں کی۔ میں پوچھتا ہوں کہ مسلم لیگ کی سیاسی تنظیم کی حقیقت کیا تھی؟ دنیا کے سامنے ہم جو کچھ چاہیں کہہ لیں مگر واقعہ اور حقیقت یہی ہے کہ مسلم لیگ شروع سے آخر تک قائدِ اعظم کا نام تھا اور بس۔ قائدِ اعظم کو جس دن بھی مسلم لیگ سے الگ کر دیا جاتا اسی دن مسلم لیگ ختم تھی۔ اور مجھے افسوس ہے کہ آج پاکستان بھی دوسرے لفظوں میں ترجمہ ہے محمد علی جناح کا۔ جس دن محمد علی جناح نہ ہوگا اس دن پاکستان کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔ میں کانپ جاتا ہوں جب غور کرتا ہوں کہ پاکستان والوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۷ر اگست کو جب قائدِ اعظم انڈین ڈومینین سے الگ ہو کر کراچی تشریف لے گئے تو وہاں مسلم لیگ کی تنظیم ختم ہو گئی تھی۔ شروع سے لیگ کے ہمنوا لوگوں میں مختلف مذاق کے لوگ تھے (۱) جو پاکستان کو

واقعی اعتقاد اور ایمان رکھتے تھے۔ وقلیل ماھم۔ مگر اُن کا مسلم لیگ اور اس کی تنظیم پر کوئی اقتدار نہ تھا۔ (۲) جو اغراضِ ذاتی سے مسلم لیگ کے عہدوں پر قابض تھے مگر جو کچھ وہ پاکستان کے لئے کہتے رہے تھے انھیں اپنے کہے کی شرم تھی۔ اس لئے پاکستان کی وجہ سے جو مسلمان قوم پر مظالم ہوئے ان کو خاموشی سے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ (۳) جو ان مظالم کو خاموشی سے دیکھ سکتے تھے۔ (۴) جنھیں پاکستان کی حقیقت پر تو کوئی یقین نہیں تھا نہ وہ اسے سمجھتے تھے۔ مگر محمد علی جناح کے خلوص اور قربانی نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ لیگ کا ساتھ دیں۔ (۵) جو دوسروں کی دیکھا دیکھی اس بھیڑ میں شریک ہو گئے تھے۔ جو پہلی قسم کے لوگ تھے وہ تو ۱۵ اگست سے پہلے ہی پاکستان کو چل دیئے۔ دوسری قسم کے حضرات ۱۵ اگست کے بعد سب سے پہلے بھاگے۔ تیسری قسم کے لوگوں میں سے اکثر چل دیئے۔ جو بہت ہی کمزور تھے وہ رہ گئے۔ چوتھی قسم کے حضرات بھی اکثر و بیشتر گرتے پڑتے بھاگے۔ اب انڈین ڈومینین میں تیسری اور پانچویں قسم کے لوگ باقی رہ گئے۔ جو ان کا سیاسی ادارہ تھا وہ تو ختم ہو ہی چکا تھا۔ مسلم لیگ کے نوے فیصدی عہدہ دار اور ورکر پاکستان کو سدھار چکے۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ جیلوں میں بند ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یہ تمام شکایتیں ہیں تو کن سے ہیں؟ کیا ان سے جو محض دیکھا دیکھی آپ کی بھیڑ میں شریک ہو گئے تھے؟ اگر اُن سے شکایت ہے تو قطعاً غلط ہے۔ جب لیگ نے میدان خالی چھوڑ دیا تو فوراً نیشنلسٹ مسلمانوں نے میدان پر قبضہ کر لیا اور یہ بھیڑ اُن کے ساتھ ہو گئی۔ چار مہینے کے بعد مسلم لیگ کو تقسیم کیا گیا۔ اگر چار مہینے پہلے لیگ کو تقسیم کر دیا جاتا تو شاید یہ منظر سامنے نہ آتا۔ اگر قوم کی سیاسی تربیت کی جا چکی ہوتی اور اس کی سیرت کی تعمیر کر دی جاتی تب یہ صورت پیش نہ آسکتی تھی اور یقیناً نہ آتی۔ ہندوستان کی سرزمین نے دو لیڈر پیدا کئے ایک محمد علی جناح اور دوسرا گاندھی۔ فتح و شکست مقدر کے ہاتھ ہے۔ سیاسی جنگ میں محمد علی جناح جیتا اور گاندھی ہار گیا۔ لیکن دونوں کے کاموں کو اگر آپ جانچیں گے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ قوم صدیوں تک گاندھی کو دعائیں دیگی اور اسے یاد رکھے گی مگر مجھے امید نہیں کہ قوم محمد علی جناح کو زیادہ عرصہ تک یاد رکھ سکے۔ کیونکہ دونوں کے کاموں کا فرق ہی یہ ہے کہ گاندھی نے قوم بنائی ہے اور محمد علی جناح نے پاکستان بنایا ہے۔ آج گاندھی ہم میں موجود نہیں ہے مگر اس نے کانگرس کو ایسی ہائی کمانڈ عطا کر دی ہے جس میں اگرچہ وہ سیاسی بصیرت پیدا نہیں کر سکا مگر قوم اور ملک کی محبت پیدا کر گیا۔ ان سے سیاسی غلطیاں

ہو رہی ہیں اور سخت قسم کی سیاسی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ مگر ان غلطیوں میں بھی قوم اور ملک کی محبت کارفرما ہے۔ اس لئے وہ غلطیاں زیادہ نقصان دہ نہیں ہیں۔ لیکن خدانخواستہ اگر کل کو محمد علی جناح ہم میں موجود نہ رہے تو ہمارے پاس ایسی ہائی کمانڈ بھی نہیں ہے جس میں حبِ قوم یا حبِ ملک کے جذبات موجود ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہ بہت ہی ناگوار اور تلخ حقیقت ہے۔ مگر کتنی ہی ناگوار اور تلخ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حقیقت ہے اور حقیقتیں اکثر تلخ ہی ہوا کرتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں پر جو کچھ گزری ہے یہ قدرت کی طرف سے تازیانۂ عبرت ہے پاکستان کے مسلمانوں کے لئے۔ ان کو ہولناک مصائب و مشکلات کا شکار اس لئے ہونا پڑا کہ خود ان میں سیاسی بصیرت اور قوم کی محبت موجود نہیں تھی۔ انھوں نے صرف قائدِ اعظم کی سیاسی بصیرت اور محبت و خلوص کے سہارے چڑھنا اور جینا چاہا تھا۔ مگر جب وہ سہارا ان سے چھین لیا گیا تو قوم اسی گڑھے میں گر پڑی جس میں وہ ابتک پلتی رہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے اس گڑھے میں بظاہر عافیت سے بیٹھی تھی اور اب بہت بلندی سے گری۔ اس لئے بہت سے ان میں سے جان سے گئے اور بہت سوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ بہت ہی تھوڑے سے ہیں جو ہاتھ پاؤں سلامت لیکر گرے ہیں۔

مگر واضح رہنا چاہئے کہ یہی وقت پاکستان کے مسلمانوں پر بھی آنا ہے اور ہندوستان کے مسلمان جس بلندی سے گرے ہیں پاکستان کے مسلمان اس سے بھی ڈبل بلندی سے گریں گے۔ ان کے ہاتھ پاؤں تو الگ رہے جانوں ہی کے لالے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ قوم کی سیرت کی تعمیر پر فوراً متوجہ ہوا جائے۔

میرے نزدیک اس وقت اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ قائدِ اعظم گورنر جنرل بن کر ہماری رہنمائی کریں۔ انھیں گورنر جنرل کے عہدہ سے فوراً استعفیٰ دیکر کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی صدارت اور مسلم لیگ کی صدارتِ عظمیٰ پر قناعت فرمانی چاہئے۔ اور جیسا کہ قائدِ اعظم نے ڈھاکہ وغیرہ میں بار بار فرمایا ہے کہ مسلم لیگ کو پاکستان کے کسٹوڈین کی حیثیت سے کام کرنا چاہئے۔ مسلم لیگ کی صدارت پر رہتے ہوئے قائدِ اعظم کو پاکستان کے کسٹوڈین کی حیثیت سے پاکستان گورنمنٹ کی رہنمائی کرنا چاہئے۔ گورنر جنرل رہتے ہوئے وہ پاکستان کے لئے اتنے مفید نہیں ہیں جتنے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مفید ہو سکتے ہیں۔ وہ قوم کو یہ نہیں سکھا سکتے کہ غلامی

میں رہتے ہوئے قوم کو اپنے حقوق کے لئے کس طرح سینہ سپر ہو کر لڑنا چاہیئے تو کم از کم جبکہ انھوں نے خود اپنے کندھوں پر بندوق رکھ کر پاکستان کا ملک فتح کر کے قوم کو دیدیا ہے، اب ہی سکھا دیں کہ جب آزادی حاصل ہو جائے تو اپنی آزادی کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور پیش آئندہ مشکلات کو کیونکر حل کیا جاتا ہے۔

قوم ابھی اتنی سعید اور ذہین نہیں ہے کہ وہ قائدِ اعظم کے نمونہ کو دیکھ کر سب کچھ سیکھ جائیگی۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ غلطیاں کرے، گرے، چوٹیں کھائے۔ اوپر سے قائدِ اعظم کی طرف سے اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ ہو۔ نیز اپنی غلطیوں کے نتائج کے اس پر جوتے پڑیں تو ممکن ہے کہ قوم کو کچھ نہ کچھ ہوش آجائے اور وہ تھوڑا بہت سیکھ جائے۔

مگر آپ جانتے ہیں کہ جب کام غلط طریقہ سے کیا جاتا ہے تو پھر قدم قدم پر مشکلات ہی پیش آتی ہیں۔ چونکہ ابتدا سے غلط بنیادوں پر کام ہوا ہے یعنی سیرت کی تعمیر جو سب سے پہلے کرنی چاہیئے تھی وہ نہیں کی گئی۔ اس لئے میری اس تجویز میں ایک خطرہ ہے اور وہ خطرہ بہت معقول ہے کہ قائدِ اعظم گورنر جنرل کے عہدہ سے الگ ہو کر یہ عہدہ دیں تو کسے دیں۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ جس شخص کو یہ عہدہ دیا جائے گا کل کو وہ فضل حق، خضر حیات اور جی ایم سید نہیں بن جائے گا، جو پاکستان کی ہی طاقت اور مشنری کو خود مسلم لیگ کو کچلنے کیلئے استعمال نہ کرنے لگے، جیسا کہ خضر حیات پنجاب میں کر چکا ہے۔ اس خطرہ کو جب سامنے لاتا ہوں تو عقل چکر کھانے لگتی ہے مگر پھر یہی کہتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن بالآخر وہ وقت تو آنا ہے جبکہ گورنر جنرل کا عہدہ ہمیں کسی دوسرے کو دینا ہوگا کیونکہ خلود کی زندگی تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہو سکی۔ اس لئے یہ عہدہ کسی دوسرے آدمی کے حوالہ ہم ایسے وقت میں کریں جبکہ قائدِ اعظم کی رہنمائی سے بھی ہم محروم ہو چکے ہوں اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ابھی سے کسی دوسرے کے حوالہ کر دیں۔ کم از کم ہمیں اس کی تعلیم بھی حاصل ہو جائے گی کہ جب کوئی شخص فضل حق یا خضر حیات بننے لگے تو ہمیں اس کا مقابلہ کیونکر کرنا چاہیئے۔

---

* ہم نے اپنے تبصرہ میں واضح کر دیا تھا کہ ہم نے اس بحث کو طنزاً نہیں چھیڑا۔ ہم نے لکھا تھا۔

ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جب یہ کچھ لکھا ہے تو اس سے یہ مفہوم نہیں کہ پاکستان کے مسلمان قوت ایمانی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ یہاں تو

تو یہ بھی یہی کچھ کرتے۔ لیکن اس سے اصل حقیقت، تو اپنی جگہ رہتی ہے، یعنی یہ کہ کسی قوم کا نامساعد حالات میں تملق پیشگی اختیار کر لینا اور مداہنت پر اتر آنا، اس قوم کی فنا آمادگی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہماری اس تنقید سے مقصود ہندوستان کے مسلمانوں کی تنقیص و تحقیر نہیں۔ ان کی تنقیص خود ہماری تنقیص ہے۔ یہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔

ہمیں کلی اتفاق ہے کہ راہنمایانِ قوم نے قومی سیرت کی تعمیر کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پاکستان کے مسلمانوں کو جو کچھ ملا ہے وہ ان کی سیرت کی پختگی کا حاصل نہیں بلکہ محض اعانِ خداوندی ہے۔ صلاحیت و اہلیت کے اعتبار سے مسلمانانِ پاکستان، مسلمانانِ ہندوستان سے کچھ بہتر نہیں لیکن ان دونوں میں جو بہت بڑا فرق ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قطعۂ ارض ہے جہاں پر اس چیز کا امکان ہے کہ وہ اپنے سیرت و کردار کی تعمیر کر سکیں اور اُن خصائص کو برقرار رکھ سکیں جو خیر امۃ ہونے کی حیثیت سے، انھیں دوسری اقوام سے ممیز کرتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں تزلزلِ ایمان اور ضعفِ خودی پیدا ہو گیا تو دس سال بعد اس خطہ میں بیرونی سیاح کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ مسلمان کہاں ہے۔ اسی لئے ہم نے لکھا تھا کہ "نامساعد حالات میں حق گوئی و بے باکی یہی قوتِ ایمانی ہے"۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت تر ابلیس سے واسطہ پڑا ہے لہٰذا ان کی خودی کہیں زیادہ مستحکم ہونی چاہیئے۔ ان کے لئے کہیں زیادہ جوشِ کردار، قوتِ ایمانی اور استحکامِ خودی کی ضرورت ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ پاکستان کو اپنی تنقید سے مستثنیٰ نہیں سمجھتے اور مسلمانانِ ہندوستان کی تنقیص کو ہم اپنی تنقیص سمجھتے ہیں۔ البتہ ہم نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اور جس سے ہمارے کرم فرما نے اس قدر اختلاف کا اظہار کیا ہے ہم اس پر اب بھی قائم ہیں۔

(طلوعِ اسلام)

اقبال اکادمی

ہم وزیرِ مالیات کی تجویز متعلقہ اقبال اکادمی کا خبر مقدم اور اس پر تبصرہ گذشتہ اشاعتوں میں کر چکے ہیں۔ اکادمی کے قیام و لائحہ عمل سے متعلق گذارشات پریس میں جا چکی تھیں کہ ہمیں مجلسِ مرکزیہ یوم اقبال لاہور کی مندرجہ ذیل قرارداد موصول ہوئی:۔

مجلس مرکزیہ یوم اقبال مسجد شاہ چراغ لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۵ مارچ میں مفصلہ ذیل قرارداد باتفاق رائے منظور ہوئی۔

مجلس مرکزیہ یوم اقبال کا یہ اجلاس حکومت پاکستان کے اقبال اکادمی کے قیام کی تجویز اور اس کے لئے اسی سال کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کی منظوری کو ایک مستحسن اقدام خیال کرتا ہے اور اس کی رائے ہے کہ یہ اقدام پاکستان کے داعی اول کی مناسب یادگار کے قیام کا صحیح اقدام اسی صورت میں سمجھا جائیگا جب داعی علیہ الرحمۃ کے اپنے تصور کے مطابق اسے عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ حکیم الامت علیہ الرحمہ کی تجویز یہ تھی کہ ملت کی صحیح نشاۃ الثانیہ کے لئے از بس ضروری ہے کہ ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جس میں قدیم اسلامی علوم و فنون کی وہ تمام کتب جمع کی جائیں جو اگرچہ نادر الوجود ہیں لیکن مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں ابھی تک باقی ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانہ میں عہد حاضر کی بھی تمام اہم علمی و فنی کتب جمع کی جائیں۔ ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ میں صحیح استعداد و قابلیت کے محققین مقرر کئے جائیں جن کی تحقیق کی غرض و غایت دو مقاصد کی حامل ہو۔ اول یہ تحقیق کی جائے کہ کس حد تک مغربی علوم و فنون کے ماخذ اسلامی محققین و مصنفین کی وہ تصانیف ہیں جن کو اگرچہ مسلمان کھو چکے ہیں لیکن وہ اب تک یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں یا وہاں کے مستشرقین کے قبضہ میں ہیں۔ دوم یہ کہ عہد حاضر کے

علمی و فنی ارتقاء سے استفادہ کا وہ طریق عمل میں لایا جائے جس سے ملتِ اسلامیہ کا مستقبل مذہب حقا اسلام کے صحیح ارتقاء کے عین مطابق ہو۔ نہ کہ اس کے خلاف یا اس کے متصادم۔ اسی مقصدِ وحید کو مدنظر رکھ کر علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنا ذاتی کتب خانہ ملتِ اسلامیہ کے لئے وقف کیا اور اس وقف کا مقصد یہ قرار دیا کہ اس کتب خانہ کو مجوزہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا مرکز قرار دیا جائے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد اس کتب خانہ کو ان کی وصیت کے مطابق اسلامیہ کالج لاہور کو منتقل کیا گیا۔ بنابریں یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ

(۱) مجوزہ اقبال اکادمی لاہور میں قائم کی جائے۔

(۲) اکادمی کی غرض و غایت وہی ہو جو علامہ علیہ الرحمۃ کی غرض و غایت اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تھی۔

(۳) اس غرض کے صحیح حصول کی ایک صورت یہ ہے کہ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کی جو تقسیم اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان عمل میں آنے والی ہے اس کے نتیجے کے طور پر لائبریری مذکور کی جو کتابیں پاکستان کے حصہ میں آئیں ان کو اقبال اکادمی کی تحویل میں دیدیا جائے۔

(۴) اقبال اکادمی کے لاہور میں قیام کی صورت میں اکادمی کا جائے وقوع پنجاب پبلک لائبریری کی عمارت ہو۔ جس کو آئندہ پبلک لائبریری رکھنے کی ضرورت نہیں اس کی موجودہ عمارت اور موجودہ کتب خانہ کو اقبال اکادمی کا جزو بنا دیا جائے۔ بالفاظ دیگر علامہ علیہ الرحمۃ کا اپنا وقف کردہ کتب خانہ موجودہ پبلک لائبریری لاہور اور انڈیا آفس کے پاکستان کے حصہ میں آیا ہوا تمام کتب خانہ اقبال اکادمی کے جامع نام سے موسوم کیا جائے اور اس میں علوم و فنون کے محققین کا تقرر جلد سے جلد عمل میں لایا جائے۔

ہم اس قرارداد کی تائید کرتے ہیں۔ لاہور کی فضا بہرکیف زیادہ علمی ہے۔ لہٰذا اکادمی کے لئے موزوں۔ ہمارے خیال میں یہ معاملہ ایک سب کمیٹی کے سپرد کرنا چاہئے جو تشکیل اکادمی کے ضمن میں دیگر تمہیدی امور کے علاوہ اس کا بھی فیصلہ کرے کہ اکادمی کا مرکز کہاں ہو۔ یہ انتخاب شیدائیانِ اقبال کے صلاح و مشورہ سے ہی طے ہونا چاہئے۔

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو

لیگ کے ایک سابق کارکن کے تاثرات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

طلوعِ اسلام کی اشاعت مارچ (۱۹۴۸ء) میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلہ پر اظہارِ خوشنودی کیا جا چکا ہے جس کے مطابق مسلمانوں کی اس قومی تنظیم کو سرکاری اثر و نفوذ سے آزاد کر کے، اس کی تنظیمِ نو کا اعلان کیا گیا ہے۔ چوہدری خلیق الزماں کو لیگ کونسل نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ نئے دستور کے مطابق مملکتِ پاکستان میں لیگ کی تنظیم کریں۔ چوہدری صاحب نے اس سلسلہ میں جو نظامِ عمل پیش کیا ہے اُس کے مطابق تنظیمِ جدید کا کام قریباً چار ماہ میں ختم ہوگا۔ ابتدائی ارکان کی بھرتی فی الفور شروع کر دی گئی ہے جو ۳۱ اپریل تک ختم ہوگی۔ ۱۵ مئی تک ابتدائی لیگوں کے انتخابات مکمل ہوں گے۔ ضلع اور شہری لیگوں کے انتخابات کی تکمیل ۱۵ جون تک ہوگی۔ پاکستان لیگ کونسل کے صوبائی نمائندوں کے انتخاب اور دوسرے ضروری امور کے لئے صوبہ لیگوں کے اجلاس ۳۱ جون تک ختم ہوں گے۔ چوہدری صاحب کو امید ہے کہ نئی کونسل جولائی کے پہلے ہفتہ تک مکمل ہو جائے گی۔[1]

جس وقت زیرِ نظر شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا پہلا مرحلہ (ابتدائی ارکان کی بھرتی) ختم ہو چکا ہوگا اور بقیہ مراحل کو طے کرنے کی تیاریوں کا آغاز ہو رہا ہوگا۔ حصولِ پاکستان کے بعد لیگ کی حیثیت میں بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ مارچ کے پرچہ میں لکھا جا چکا ہے، اب تک لیگ کی

[1] بعد میں اس پروگرام میں ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی ہے۔

حیثیت ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک فریقِ متخاصم سے زیادہ کچھ نہ تھی، لیکن اب مسلم کی حیثیت یہ ہوگی کہ وہ حکومت کے عزائم واعمال پر محتسبانہ نگاہ رکھے اور اس امر کا جائزہ لیتی رہے کہ حکومتِ پاکستان کا قدم جادۂ حق وصداقت سے ہٹنے نہ پائے۔

اس اعتبار سے لیگ کا دورِ جدید اس کے دورِ گذشتہ سے سراسر مختلف ہوگا۔ لہٰذا اس کی تنظیمِ نو میں اس کی موجودہ اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اب غیر معمولی حزم واحتیاط کی ضرورت ہوگی۔ کارکنوں اور عہدیداروں کے انتخاب کے سابقہ معیار بدلنے پڑیں گے۔ الغرض لیگ کی تنظیم پوری سنجیدگی اور دیانتداری سے کرنا ہوگی۔ ان سطور کے راقم کو پنجاب میں لیگ کے دورِ گذشتہ میں اس کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے کام کرنے کا بہت موقع ملا ہے۔ سات سال کے ذاتی تجربہ کی بنا پر جو اس عرصہ میں شریک سوز وساز ہو کر حاصل ہوا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لیگ کسی وقت بھی صحیح معنوں میں ایک تنظیم نہیں بن سکی۔ لیگ نے ہنگاموں اور نعروں سے، جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے، آتش بار تقریروں اور شعلہ فشاں بیانوں سے اپنے مقصد کو پالیا۔ اور اتنے قلیل عرصہ میں کہ خود اربابِ لیگ اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جس حد تک جماعتی تنظیم کا تعلق ہے وہ کسی وقت بھی پیدا نہیں ہو سکی۔ مقامی طور پر کئی جگہوں پر اچھے اچھے کارکن موجود تھے جو مخلصانہ اور گرمجوشانہ کام کرتے تھے لیکن ان کی سرگرمیوں میں کوئی ربط نہیں ہوتا تھا۔ اس ربط کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایسے کارکنان کو تو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور دیگر ارکانِ لیگ بالکل بے کار ومعطل رہتے تھے۔ کسی جماعت کے پاس کوئی نظامِ عمل نہ تھا۔ ایک ابتدائی لیگ اپنی ہمسایہ ابتدائی لیگ کی سرگرمیوں سے بے خبر تھی۔ ضلع لیگ کو اپنی شاخوں کا کچھ علم نہ تھا۔ شہری لیگ کو اپنی حدود کا پتہ نہیں تھا اور صوبائی لیگ کے پاس کوئی مستند ریکارڈ نہیں تھا کہ اس کے ماتحت کتنی جماعتیں ہیں، ان کے عہدیدار کون کون سے ہیں اور ان کے ارکان کی تعداد کتنی ہے۔ ہر سال لیگوں کے نام نہاد انتخابات بھی ہوتے رہے لیکن ان کی حیثیت بھی عام طور پر ایک فریب سے زیادہ کچھ نہ ہوتی تھی۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر صوبائی جماعتوں کے انتخابات تک کوئی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ چنانچہ جو لوگ ایک دفعہ لیگ کی جماعت پر چھا گئے، ان کا تسلط آخر تک برقرار رہا۔ اس کے بعد اچھے کارکنوں کو تنظیمِ لیگ میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل

نہ ہو سکی اور بہت کم جماعتیں آخر تک اپنے حلقوں کی صحیح نمائندہ رہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ابتدائی جماعتوں کا عوام سے، مختلف جماعتوں کا ایک دوسری سے، ابتدائی جماعتوں کا ضلع لیگ سے اور ضلع لیگ کا صوبائی لیگ سے کوئی ربط نہیں ہوتا تھا۔ اس عدم ارتباط کے علاوہ، ہر جماعت — ادنیٰ و اعلیٰ — کی اندرونی تنظیم ناپید تھی، بلکہ اس عمارت کی خشتِ اول ہی غلط رکھی جاتی تھی۔ پنجاب مسلم لیگ کے آئین میں ابتدائی لیگ کے ارکان کی کم سے کم تعداد پچاس رکھی گئی تھی۔ اس کے مطابق اگر کسی ایک گاؤں میں ارکان کی تعداد پچاس سے کم ہو تو اسے نواحی گاؤں سے ملا کر ایک وحدت بنا دینے کی اجازت تھی تاکہ اس وحدت کے ارکان کی تعداد کم از کم پچاس ہو جائے لیکن عملاً اس شرط کو بہت کم پورا کیا جاتا تھا۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ اگر ایک گاؤں میں ایک شخص کو کام کرنے کا شوق ہوا تو اُس نے ایک برائے نام صدر، نائب صدر اور دیگر عہدیدار "بنا کر" اور خود سیکرٹری کے فرائض سنبھال کر جماعت کی تشکیل کر دی۔ یہ دیکھنے کی کبھی بھی کوشش نہ کی گئی کہ اس کے ابتدائی ارکان کی تعداد پچاس ہو سکتی ہے یا نہیں۔ دوسری طرف یہ ہوتا رہا کہ کئی بڑے قصبات میں کوئی ابتدائی جماعت ہی نہ تھی، اس لئے کہ وہاں کوئی اس قسم کا "ایک شخص" موجود نہ تھا۔ جن نام نہاد ابتدائی جماعتوں کی تشکیل بھی ہوئی اُن کے دائرۂ عمل میں بہت کم عام ارکان کی بھرتی کی ضرورت محسوس کی گئی اور لطیفہ یہ ہے کہ خود عہدیداروں میں سے بیشتر حضرات لیگ کے باضابطہ رکن نہیں ہوتے تھے۔ آج بھی اگر رکنیت کی پڑتال کی جائے تو لیگ کے کئی ممتاز قائدین اور صوبائی مجالس مقننہ کے وہ خوش قسمت لیگی ارکان، جو کئی مخلص اور دیرینہ خادمانِ لیگ کا حق غصب کر کے لیگ کے ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، کسی ابتدائی جماعت کے رکن نہیں نکلیں گے۔

ان نام نہاد ابتدائی لیگوں کی سرگرمیاں صرف اس حد تک محدود تھیں کہ ان کے عہدیداروں کے نام وقتاً فوقتاً چھپ جایا کریں۔ انھیں بہت کم کام کرنے کا سلیقہ تھا اور اوپر سے انھیں کسی قسم کی راہنمائی یا سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس ابتدائی لیگ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کی بالا جماعت (Parent body.) کون سی ہے۔ پنجاب لیگ کے آئین میں وحدت (Unit) ابتدائی لیگ تھی اور اس کے اوپر دوسرے درجہ پر ضلع لیگ تھی۔ لیگ کے آئین میں تحصیل لیگ کا وجود نہیں تھا، جس کی وجہ سے ابتدائی لیگوں کو ضلع کی

ربط قائم رکھنے میں بہت دِقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ طبعی مشکلات کے علاوہ، شہری اور دیہاتی مزاج کا بُعد تھا جو ماتحت شاخ اور ضلع لیگ میں خلا بن کر حائل ہوتا تھا۔ کئی مقامات پر تحصیل کے صدر مقام کی لیگوں نے اپنے آپ کو ابتدائی شاخوں کا حاکم سمجھنا شروع کر دیا۔ گذشتہ صوبائی مجالسِ مقننہ کے انتخابات میں، پنجاب صوبائی لیگ نے اس کمی کو خود محسوس کیا، اور ہنگامی طور پر، ابتدائی لیگ اور ضلع لیگ کے درمیان تحصیل لیگ کو تسلیم کر لیا۔ یہ وقتی اقدام صرف ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تھا اور، انتخابات ختم ہو جانے کے بعد، اس ضرورت کا احساس کوئی مزید عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ عارضی طور پر تحصیل لیگ کے وجود کو تسلیم کر لینے میں ایک قباحت یہ پیدا ہوئی کہ جس جماعت کو "تحصیل لیگ" کا نام دیا گیا وہ تحصیل کے صدر مقام کی لیگ تھی اور اپنے حلقہ کی بھی پوری نمائندہ نہ تھی۔ جب دیہات کی لیگوں نے تحصیل کے صدر مقام کی لیگ سے ربط پیدا کیا تو انھیں بیگانگت اور اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ کئی ایک "تحصیل لیگوں" میں یہ مطالبہ کافی تقویت پکڑ گیا کہ ان کے نئے انتخابات کرائے جائیں، کیونکہ یہ اپنی تحصیل کے حلقوں کی نمایندگی کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ چونکہ مجالسِ مقننہ کے انتخابات کے پیشِ نظر لیگ کے انتخابات ملتوی ہو چکے تھے، اس لئے تحصیل لیگ اور ابتدائی لیگوں میں غیریت باقی رہی۔

اس نام نہاد تحصیل لیگ کے پاس اپنی شاخوں اور ان کی سرگرمیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا بلکہ بیشتر تحصیل لیگوں کے پاس سرے سے دفتر ہی نہیں تھا۔ دفتر کی عدم موجودگی میں عوام کو اپنی "نمایندہ" جماعت سے ربط پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس جماعت کے پاس نہ کارروائی کا ریکارڈ تھا نہ ارکان کی فہرست، نہ چندہ کا حساب رکھنے کی تو ضرورت ہی بہت کم محسوس کی جاتی تھی، کیونکہ بقول شخصے حساب رکھنا بنیوں کا کام ہے۔ حساب کتاب کی بے قاعدگی سے وہ حد شروع ہوتی ہے جہاں سے عوام کا اعتماد متزلزل ہونا شروع ہوتا ہے۔ قومی جماعتوں کی بدنامی اور ناکامی کا بیشتر سبب یہی بے ضابطگی ہوتا رہا ہے۔ اس بے ضابطگی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جماعتوں نے دفتر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی یا وہ دفتر کھولنے کا اہتمام نہیں کر سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دفتر کے بغیر حساب کتاب کی باقاعدگی مشکل ہے۔ دوسری وجہ اس بے ضابطگی کی یہ ہے کہ ضلع یا صوبہ کی طرف سے کوئی محاسب نہیں تھا۔ ضلع کی تنظیم

بھی ابتدائی اور تحصیل لیگوں سے کچھ بہتر نہ تھی۔ جس طرح ماتحت شاخوں کے "انتخابات" اندھے کی ریوڑیوں کی تقسیم ہوتے تھے، اسی طرح ضلع لیگ بھی ایک محدود طبقہ کی نمائندہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ابتدائی جماعتوں یا ان کے ارکان کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں تھا۔ ضلع کے انتخابات میں ان شاخوں کو کبھی بھی شریک نہیں کیا گیا۔ اس سے "شہری" اور "دیہاتی" مغائرت کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ قارئینِ طلوعِ اسلام کے لئے یہ انکشاف شاید باعثِ حیرت ہو اور شاید وہ اسے صحیح باور نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک ضلع میں لیگ کا کوئی دفتر ہی نہیں تھا۔ ضلع کے باہر اور اخبارات کے صفحات پر ضلع لیگ ایک زندہ و فعال جماعت تھی لیکن خود ضلع کے اندر اس کا وجود ناپید تھا۔

ضلع لیگ کے اس فقدان کا نتیجہ یہ تھا کہ ضلع کے صدر مقام کی شہری لیگ نے اپنے آپ کو سارے ضلع کا حاکم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ اس شہری لیگ کے ذرائع، شہر میں رہنے اور لمبے بازو رکھنے کے طفیل، وسیع تھے، اس لئے وہ ضلع کی شاخوں پر رعب ڈال سکتی تھی۔ ضلع لیگ کی عدم موجودگی میں 'ماتحت' کارکنوں کو اس شہری لیگ سے کئی بار مشورہ طلب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا جیسے ایک ڈپٹی کمشنر ایک پٹواری سے ملتے ہوئے کرتا ہے۔ شاخوں کے پاس ذرائع نشر و اشاعت ناپید تھے اس لئے ان کی کارکردگی اپنے حلقوں سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ شہری لیگ کچھ کام نہ کرنے کے باوجود، اخبار کے تراشوں کے زور سے یہ منوا سکتی تھی کہ اس نے اس قدر کام کیا ہے۔ اس اندھیر گردی کی وجہ یہ تھی کہ ضلع کی کوئی تنظیم نہ تھی۔ اسی "انتشار کی تنظیم" سے صوبہ لیگ کونسل کے نمائندوں کا "انتخاب" ہوتا تھا۔ اس "انتخاب" کی کیفیت یہ تھی کہ ضلع کا سب سے زیادہ شور کرنے والا (Vociferous.) اور شاطر اپنی پسند کے چند آدمی صوبائی کونسل میں لے جاتا تھا، جن میں سے بیشتر اس ممتاز جماعت کی یہ ذمہ دارانہ حیثیت سنبھالنے کی اہلیت سے کلی طور پر محروم ہوتے تھے۔ آپ صوبہ پنجاب کی لیگ کونسل کے ارکان کی فہرست دیکھ جائیے۔ آپ کو ایک ہی قسم کے لوگ نظر آئیں گے جو ہر سال صوبہ کی اس قومی پارلیمان میں "منتخب" ہو کر آتے رہے ہیں۔

ان مشترک الاغراض لوگوں کے صفِ اول میں آجانے سے مخلص، بے لوث اور خاموش کام کرنیوالوں کو

بالکل پیچھے پھینک دیا گیا۔ چنانچہ پنجاب لیگ نے اپنے زیرِ اہتمام جس قدر بھی کارکنوں کے اجتماعات کئے، اُن میں انہی لوگوں کو شریک کیا، جنھیں کام کرنے کے بہت کم مواقع ملے ہیں۔ شہروں میں لیگیں عموماً معطل ہوتی ہیں۔ ان کا کام صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ کسی لیڈر کی آمد پر، کسی پبلک جگہ پر، ایک جلسۂ عام کا انعقاد کر دیں۔ اس کے بعد کام خبر رساں ایجنسیوں کا رہ جاتا ہے، جو اس جلسہ کی روئداد نشر کر دیتی ہیں اور دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں لیگ اتنا کام کر رہی ہے۔ شہری لیگوں کو کام کے لئے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں، جو دیہات میں یکسر ناپید ہوتی ہیں۔ اس لئے لیگ کی حقیقی خدمت کا مزہ کچھ انھیں لوگوں کو آیا ہے جنہیں دیہات کے دشوار گذار راستوں پر، موسمی حوادث کے شدائد کا مقابلہ اور اپنی طبعی ضروریات کو قربان کرتے ہوئے، اجڈ اور اکھڑ عوام میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ضلع اور صوبہ کے عمائدین کی نظر میں یہ کام اس لئے "کام" نہیں تھا کہ اس کا چرچا اخبارات میں نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ انتخاباتِ عمومی کے بعد، پنجاب مسلم لیگ نے لیگ کی تنظیم میں نئی روح پھونکنے کے لئے کارکنوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ راقم الحروف نے، اپنی بے بضاعتی کے باوجود، دفتر صوبہ لیگ کو لکھا کہ اسے بھی، اس اجتماع میں شرکت کی اجازت دی جائے تاکہ دیہات میں کام کرنے والوں کی ضروریات و مقتضیات کو بھی پیش کیا جا سکے۔ راقم، صوبہ لیگ سے سفر خرچ کا خواہش مند نہیں تھا۔ لیگ کے جسدِ مردہ میں روح پھونکنے کے متعلق، اپنے تجربات کی روشنی میں چند تجاویز پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ مانا کہ صوبہ لیگ میں پنجاب کے بہترین اہلِ دماغ موجود تھے، لیکن کبھی "کودکِ ناداں" بھی خردمندوں کو خرد کی بات سمجھا سکتا ہے۔ دفتر صوبہ لیگ نے، نہایت حقارت سے، اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور جواب دیا کہ اس اجتماع میں شہری کارکنوں کے سوا کسی کو شرکت کی اجازت نہیں۔ اس کانفرنس میں کیا قابلِ عمل تجاویز طے ہوئیں اور لیگ کی تنظیمِ جدید کے لئے کیا عملی کارروائی کی گئی؟ اس کا جواب اُس سکوتِ مرگ سے دریافت کیجئے، جو اس کانفرنس کے بعد پنجاب کی لیگ پر طاری ہوا۔

یہ ایک انفرادی واقعہ نہیں بلکہ یہ عکس ہے اس عام مایوسی اور بددلی کا، جو لیگ کے بے غرض خادموں کو، بارہا اپنی جماعت اور جماعت کے قائدین کے ہاتھوں ہوئی۔

ضلع کے اوپر، صوبہ لیگ بھی اسی طوائف الملوکی کا مظہر تھا۔ چونکہ اس دیوار کی بنیادی اینٹ ہی غلط رکھی جاتی تھی، اس لئے اوپر تک اس کا کج چلا جانا موجبِ حیرت نہیں تھا۔ درمیان کی کڑیوں کے منتشر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صوبہ لیگ کے قائدین اور عوام المسلمین میں قطبین کا بُعد ہو جاتا تھا اور دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی تھی۔ عوام نے اس بُعد کے باوجود اپنے فرض کو کما حقہ، سرانجام دیا، لیکن انھیں یہ احساس مضطرب کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ ان کے لیڈر "ان میں سے" نہیں ہیں۔ وہ ان لیڈروں کے گلوں میں پھولوں کے ہار بھی ڈالتے تھے، انھیں زندہ باد بھی کہتے تھے اور پوری عقیدت سے ان کی تقاریر بھی سنتے تھے لیکن وہ، زیرِ لب، یہ نیاز مندانہ گلہ بھی کرتے تھے کہ ان کے لیڈروں نے کبھی ان سے گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا، کیوں کہ دونوں کے مزاجوں میں بدیہی تضاد و تبائن تھا۔ وہ جلسہ ہائے عام میں قوم کے درد سے بے قرار نظر آتے تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں اپنے اس کارنامہ پر فخر کیا کرتے تھے کہ لیگ نے مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا ہے، لیکن انھوں نے، کسی وقت بھی، اپنی بلندیوں سے اتر کر، اس قوم کو خود دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کبھی اپنی قوم کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ لیگ کے بیشتر فیصلے قوم کے لئے نہ صرف باعثِ حیرت، بلکہ پریشان کن ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو طبائع کا یہ تضاد تھا، جو دونوں ۔ قائدین اور پیروکاروں ۔ کو ایک دوسرے کے قریب تر ہونے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مانع تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اضلاعی جاعتوں کی طرح صوبائی لیگ بھی ایک محدود سے طبقہ کا اجارہ تھی۔ ایک شخص، جو ایک دفعہ اپنی دنیاوی وجاہت کے بل بوتے پر صوبہ لیگ تک پہنچ جاتا تھا، مستقلاً مسلط ہو جاتا تھا۔ اس سے مرکز پر اس طبقہ کا مستقل اجارہ قائم ہو جاتا تھا۔ صوبہ پنجاب لیگ کی کمانِ عالیہ کو دیکھئے ۱۹۴۴ء کے بعد، جب سے پنجاب لیگ، یونینسٹ آمیزش سے پاک ہوئی ہے، ایک ہی گروہ لیگ ہائی کمانڈ پر چھایا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد، صوبہ لیگ نے مختلف مقاصد کے لئے جو مختلف ذیلی مجالس وغیرہ تشکیل کیں، اُن میں بھی یہی لوگ نظر آتے ہیں۔ صوبائی لیگ کی مجلسِ عاملہ، پارلیمانی بورڈ، مجلسِ عمل، پارلیمانی پارٹی اور دوسری ہر ذیلی مجلس میں ایک ہی گروہ ہے، جو مختلف رنگ بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔ اگر آپ پارلیمانی بورڈ کا لیبل اتار کر اس پر مجلسِ عمل کا لیبل لگا دیں

تو آپ مطلق یہ محسوس نہ کریں گے کہ آپ کے ہاں مجلسِ عمل موجود نہیں ہے۔ ایک ہی شخص ایک وقت میں مختلف النوع فرائض سرانجام دے رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کام بھی مکمل نہیں ہو رہا۔ اس اجارہ داری (Monopoly) نے جہاں دوسرے کارکنوں کو اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع سے محروم رکھا ہے وہاں لیگ کو اغراض کی جنگ کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ یہ بظاہر ایک الزام معلوم ہوگا، لیکن اگر آپ صوبائی مقننہ کے انتخابات کے دوران میں لیگ ٹکٹ کی تقسیم کا منظر سامنے لائیں تو آپ پر اس الزام کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس کی حد یہ ہوئی کہ وزارتی مناصب کی تقسیم کے وقت بھی یہی لوگ پیش پیش نظر آئے اور ان مناصب کے حصول کے لئے بے چاری قوم کو حسبِ معمول فراموش کر دیا گیا۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ لاکھوں بے گناہ مسلمان موت کا شکار ہو رہے تھے اور بے تابانہ اپنے اُن نمائندوں کی تلاش کر رہے تھے جنہیں انہوں نے ووٹ دیئے تھے، یہ نمائندے اپنے مرکزوں کو چھوڑ کر لاہور کے در و دیوار کو اپنی کاروں کی گرد سے آلودہ کر رہے تھے تاکہ صوبہ کی وزارت کوئی دوسرا چھین کر نہ لے جائے۔

مقننہ کے انتخاب کے لئے لیگ ٹکٹ کی تقسیم کے متعلق توقع یہ کی جاتی تھی کہ پارلیمانی بورڈ مختلف امیدواروں کی قابلیت، بے غرضی اور سابقہ خدمات کو پیشِ نظر رکھ کر انتخاب کرے گا اور جہاں اُسے اس انتخاب میں دقت پیش آئی، وہاں ماتحت اضلاعی اور دیگر جماعتوں سے مشورہ کر لیا جائے گا۔ یہ توقع عین فطری تھی، کیونکہ صوبائی قائدین ہر امیدوار کے متعلق ذاتی معلومات نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں مقامی جماعتیں ہی بہتر مشورہ دے سکتی تھیں۔ لیکن پارلیمانی بورڈ نے اپنی کسی ماتحت جماعت سے مشورہ لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور بالا بالا چند ایسے آدمیوں کو ٹکٹ دیدیئے، جن کی ساری عمر لیگ کے مقاصد کی خلاف ورزی کرتے گذری تھی، جو بدترین قسم کے کاسہ لیس اور حکام پرست تھے، جو تعلیم کے اعتبار سے صفر تھے۔ لیکن جن کی سب سے بڑی۔ اور ایک ہی۔ خوبی یہ تھی کہ وہ کسی بڑے لیڈر کے منظورِ نظر تھے۔ ممکن ہے صوبائی پارلیمانی بورڈ کو یہ خدشہ ہو کہ مقامی جماعتوں کے مشورے جانبدارانہ ہوں گے۔ لیکن اس خدشہ کو وہ یوں رفع کر سکتے تھے کہ ہر حلقہ میں خود جا کر، وہاں کے رائے دہندگان کا عندیہ معلوم کرتے اور مقامی جماعت کے مشورے کے ساتھ اپنے جائزے کا موازنہ کر کے، فیصلہ دیتے۔ لیکن اس میں

صوبائی قائدین کا کچھ تصور نہ تھا۔ لیگ کی تنظیم کی یہ دیوار، جو خشتِ کج پر رکھی گئی تھی، اوپر تک ٹیڑھی جا رہی تھی۔ باہمی ربط اوپر تک مفقود تھا۔

ابتدائی لیگوں سے صوبہ لیگ تک باہمی ربط کی یہ کیفیت تھی۔ اب اس سلسلہ کی آخری کڑی — صوبائی دفتر — کو لیجئے۔ صوبہ پنجاب لیگ کے دفتر کی عمارت زائرین کے لئے خاصی جاذب تھی لیکن دفتری نظام سرے سے غائب تھا۔ دفتر میں دیدہ زیب فرنیچر بھی موجود تھا اور بڑی بڑی تنخواہوں والا عملہ بھی لیکن اس کی دفتری کیفیت لیگ کے دوسرے تنظیمی پہلوؤں سے کہیں زیادہ مایوس کن تھی۔ ہمیں بارہا صوبہ لیگ کو مراسلات لکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن ایک آدھ کے سوا کسی خط کی رسید تک بھی موصول نہ ہوئی۔ ماتحت شاخیں عجیب الجھن میں تھیں۔ وہ ضلع لیگ سے مشورہ نہیں لے سکتی تھیں، کیونکہ ضلع میں لیگ ہی نہ تھی اور صوبہ لیگ کے نازک مزاج تابِ سخن نہیں رکھتے تھے۔ انتخاباتِ عمومی کے دوران میں صوبہ لیگ کے دفتر کو کچھ منظم کیا گیا۔ لیکن انتخابات کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس عارضی تنظیم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انتخابات میں کئی کمزور حلقوں کو مالی امداد دی گئی تھی۔ صوبہ لیگ کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اس نے اس کے بعد آج تک، حساب کتاب کی پڑتال کرنا تو درکنار اتنا بھی دریافت نہ کیا کہ انتخابی مہم پر کس قدر خرچ کیا گیا ہے۔

تنظیم کی اس تصویر کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔ اس کے اوپر مرکزی لیگ کو ہم عمداً نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اسی خاکے سے لگایا جا سکتا ہے، جو سطورِ بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تھی وہ لیگ، جو مسلمانوں کے افکار و آرا کی ترجمان، ان کی ملی آرزوؤں کی آئینہ دار اور ان کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور یہ تھی اُس لیگ کی تنظیم جس کے بل بوتے پر ہم دنیا کی سب سے بڑی ملوکیتی طاقت۔ برطانیہ اور دنیا کی ایک بہت بڑی سرمایہ دار اور منظم قوم — ہندو سے ٹکر لے رہے تھے۔ ہم نے اپنے مقصد کو پا لیا۔ تنظیم کے اس فقدان کے باوجود ہم کو پاکستان حاصل ہو گیا۔ یہاں تک ہم نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اس کے بعد —

اس کے بعد آج جب اس انعامِ عظیم کی امانت کو سنبھالنے کا وقت آتا ہے تو ہمیں بالعموم ہر طرف شکاری ہی شکاری نظر آتے ہیں جو للچائی ہوئی نگاہوں سے اس امانت کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے اپنی دس سالہ جدوجہد میں کوئی بھی گروہ ایسا نہیں پیدا کیا جو خائن نہ ہو اور جو پاکستان کا صحیح امین

بن سکے؟ گذشتہ دس سال میں لیگ کے سینکڑوں قائدین منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے قوم سے داد و تحسین حاصل کی۔ ان کے ناموں کے چرچے ہوئے۔ یہ کیا قیامت ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھی آج پاکستان کو سنبھالنے کے اہل نظر نہیں آتے؟ ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک ایسی داستان ہے جو تلخ حقیقتوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیا ان حقیقتوں کو اس لئے پوشیدہ رکھا جائے کہ یہ تلخ ہیں؟ جگر تھامئے اور اس داستان کو سُن لیجئے۔ اس میں عبرت و موعظت کے جواہر پنہاں ہیں۔

ان تلخ حقائق کو پیش کرنے سے مقصود اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی تشہیر نہیں نہ کسی کی تنقیص و تحقیر بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اب جبکہ بدلے ہوئے حالات میں ہم مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کر رہے ہیں، ہم سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہ کریں اور لیگ کو ایک مخصوص اور محدود طبقہ کا اجارہ بنا دینے کی بجائے صحیح معنوں میں عوام کی ترجمان بنائیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹-۲۱ء میں براعظم ہند سے بیرونی اقتدار کو ختم کر دینے کی ایک بہت بڑی کوشش کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا تصور بھی اقدامِ بغاوت سے کم نہیں تھا۔ باشندگانِ ہند کے فطری جذبۂ حریت کو چند ہنگامی واقعات نے تیز تر کر دیا۔ اس دور کی جنگِ آزادی، جو کہنہ و فرسودہ نظامِ وقت کے خلاف ایک عام بغاوت تھی، ایک بہت بڑی جسارت تھی۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے، اس وقت آزادی کا تصور بھی بغاوت سے کم نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا نام لینے والوں کے ساتھ دس نمبر کے بدمعاشوں سے بھی زیادہ ذلیل سلوک کیا جاتا تھا۔ جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو علیحدہ سہولتوں یا امتیازی سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انھیں عام اخلاقی قیدی متصور کیا جاتا تھا اور کسی سیاسی قیدی کو، خواہ وہ اپنے مجلسی درجہ اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اے یا بی یا سپیشل کلاس کی نعمتوں سے متمتع نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مولانا محمد علی مرحوم ایسے مسلم الثبوت راہنما بھی جیلوں میں چکی پیسا کرتے تھے، کنوؤں میں جُتتے تھے اور رسّے اور بالک کے ڈنڈل کھایا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزادی کا نام لینے پر لوگوں کو شاہراہِ عام پر ٹکٹکی سے باندھ کر تازیانے لگائے جاتے تھے اور انھیں پیٹ کے بل رینگنے کا انسانیت سوز حکم دیا جاتا تھا۔ محض شبہ پر جائدادیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ لڑکے کے "گناہ" پر باپ کی پنشن بند

کر دی جاتی تھی۔ حکومت کی اس متشددانہ اور ذلیل کارروائی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہی لوگ میدان میں اترنے کی جرأت کر سکتے تھے جو ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ جو سب کچھ لٹا دینے پر بھی اپنے ہاں کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ جن کے سر میں حقیقی انقلاب کا سودا اور دل میں حریت کا جوش تھا۔ یہ طبقہ بالعموم غریبوں کا طبقہ تھا جو لوگ بڑی بڑی جیثیتوں کے مالک تھے وہ سیاسی سرگرمیوں سے نہ صرف الگ رہے بلکہ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے اجیروں کی حیثیت سے تحریک آزادی کو ناکام کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ قوتِ فرعون کے ان مریدوں نے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کا اثر زائل کرنے کے لئے امن سبھائیں بنائیں تاکہ لوگوں کو امن و سکون (یعنی سکوت و جمود) کی تلقین کی جا سکے۔ تحریک عدم تعاون میں یہی لوگ تھے جو حکومت کی انتظامی مشینری کے سر کل پرزے بن کر دوائر اعلیٰ میں قبولیت کا مقامِ بلند حاصل کر رہے تھے۔ یہ لوگ بالطبع جمود پسند تھے۔ وہ ہر تغیر کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ سیاسی تحریک سے اُن کی علیحدگی اس مقصد کے پیشِ نظر تھی کہ اُن کے مراتب و مدارج سرکاری عتاب سے محفوظ رہیں اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر انھوں نے ہر وہ حرکت کی جو حکام کو خوش کرنے کے لئے کی جا سکتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اپنی اُس قوم سے غداری کئے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا جو اُس وقت کے نظام کو اُلٹ دینے کے درپے تھی۔

اس طرح غریبوں اور امیروں میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی۔ غریب جیلوں میں تھے یا پولیس اور فوج کی لاٹھی اور گولی کا شکار۔ اور امیر ان غریبوں کے مصائب پر اپنی دنیوی برتری کے قصر تعمیر کر رہے تھے۔ قدرتی طور پر ان حکام پرستوں، کاسہ لیسوں اور غداروں (یا اس وقت کے موزوں ترین خطاب کے مطابق ٹوڈیوں) کی حیثیت اپنی قوم میں اچھوتوں کی سی رہ گئی۔ معاشرے میں وہ سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کی قدر و منزلت صرف حکومت کے ایوانوں تک محدود تھی۔ اُن کے خلاف جذبۂ نفرت کا یہ عالم تھا کہ آزادانہ چلنا پھرنا اُن کے لئے دشوار تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے عشرت کدوں میں گوشۂ گمنامی میں گم ہو گئے۔

بالآخر تحریکِ آزادی کا یہ متشددانہ[1] دور ختم ہوا۔ یہ تحریک مرورِ وقت کے ساتھ زور پکڑتی گئی۔ لیکن اس

---

[1] ملحوظ رہے کہ مقالہ زیرِ نظر میں تحریکِ آزادی سے مراد صرف وہ جنگِ حریت ہے جو اسلامیانِ ہند کو تحریکِ خلافت اور بعد میں تحریکِ پاکستان کی صورت میں لڑنا پڑی۔ ہندوؤں کی تحریک اس کے بعد بھی متشددانہ رہی کیونکہ ان کی تحریک کی بنیاد ہی تخویف و ترہیب پر تھی۔

میں تشدد و دہشت انگیزی کی بجائے آئینیت (Constitutionalism) کا عنصر غالب ہوتا گیا۔ پیہم ناکامیوں اور غیر مختتم مصائب نے عوام کو تھکا دیا۔ اس موقع پر ایسے قائدین میدان میں نکلے جو قوم کے مصائب پر مضطرب تھے۔ انھیں تحریک آزادی سے پوری ہمدردی تھی لیکن وہ بالفطرت ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک تھے۔ ان کے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں تھا اس لئے وہ اب تک طوفان آشنا قوم کی قیادت کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے۔ آئین پسندی کا دور شروع ہونے پر یہ حضرات منظرِ عام آگئے۔ انہی گرم مزاج معتدلین کے سرخیل قائدِ اعظم تھے۔ قائدِ اعظم ایک دور اندیش حقیقت بیں اور محتاط سیاستدان اور ماہر آئین ہونے کی حیثیت سے، قوم کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ مزید ہنگامی قربانیاں مسلمانوں کے لئے مفید نہیں۔ نہ وہ اس کے اہل ہی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی قیادت میں مسلم سیاسیات کو اس نہج پر چلایا کہ اس سے "تصادم" کا کم سے کم امکان تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ وہ تصادم (براہِ راست اقدام) کو خودکشی کے مرادف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے قوم سے گولیاں یا لاٹھیاں کھانے، جیلوں میں جانے، عدم تعاون کرنے یا متشددانہ کارروائی کی بجائے اتحاد اور تنظیم کی اپیل کی۔ مسلمانوں کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی تلقین کی۔ جوش و غضب کے غیر آئینی مظاہرہ سے روکا۔ گویا اب دماغی اور کاغذی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں حکومت کے عتاب کا خطرہ نہ تھا۔ ایک تو اس لئے کہ یہ آئین و قانون کی حدود سے باہر نہ تھی اور دوسرے اس لئے کہ زمانہ بدل چکا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا تھا کہ آزادی کا تصور بھی بغاوت قرار دیا جائے۔ آزادی کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔ اب ہر شخص آزادی، بھیک یا انعام کے طور پر نہیں بلکہ اپنا پیدائشی حق سمجھ کر طلب کر رہا تھا۔ آزادی کی پکار گلی کوچوں میں گونجنا شروع ہو گئی تھی۔ سیاست کے اس آئینی دور میں دنیوی مناصب و مراعات کھو جانے کا اندیشہ نہ تھا۔

سیاسی جد و جہد کے اس پُرسکون اور آرام دہ پلیٹ نے جہاں ان کارکنوں کو میدان سے ہٹا دیا جو آئین پسندی کو بزدلی اور کمزوری سمجھتے تھے، وہاں اُن عافیت کوش اور آرام طلب "بزرگوں" کو سامنے لا کھڑا کیا جو اب تک سیاسی تحاریک سے الگ تھلگ رہنے اور حکومت کی طرفداری کرنے کے سبب

عوام میں اپنا وقار ضائع کر بیٹھے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک عمدہ موقع ہاتھ آگیا۔ وہ مسلم لیگ کی بے ضرر تحریک میں جوق در جوق شامل ہونا شروع ہو گئے۔ قائدِ اعظم کو اس وقت جاں باز کارکنوں کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ ایسے آدمی اپنے گرد چاہتے تھے جو ان کی لفظی تائید کرتے رہیں۔ چونکہ قائدِ اعظم قوم کے سامنے چندے کے لئے ہاتھ پھیلانا بھی نہیں چاہتے تھے، اس لئے انھیں ایسے صاحبِ ثروت حضرات کی ضرورت تھی جو لیگ سے کچھ طلب نہ کریں بلکہ لیگ کے لئے انھیں جو کچھ خرچ کرنا ہو اپنی گرہ سے کریں۔ اس متمول اور کھاتے پیتے طبقہ کی شمولیتِ لیگ سے قائدِ اعظم کو لیگ کے مالیات کی طرف سے بے فکری ہو گئی اور وہ، یکسو ہو کر، پاکستان کی آئینی جنگ لڑنے میں لگ گئے۔ غریب، لیکن آزمودہ کار، کارکن لیگ سے کچھ عرصہ تک شکوک و شبہات کی بنا پر علیحدہ رہے لیکن جب انھوں نے اس میں آنے کا فیصلہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس جماعت پر بالعموم وہ لوگ غالب آچکے ہیں جن کا سابقہ کردار کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں رہا اور جو لیگ کے نام پر محض اپنی کھوئی ہوئی حیثیتیں پھر قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ رفتہ رفتہ دولت و سرمایہ کا، لیگ کی تنظیم میں اس حد تک نفوذ ہو گیا کہ عملی طور پر اس جماعت کے دروازے غریبوں پر بند ہو گئے۔ جو غریب کارکن لیگ میں داخل ہوئے وہ کسی وقت بھی اگلی صفوں میں نہ آسکے۔ کیونکہ لیگ میں ذمہ داری کا مقام لینے کے لئے معیار ہی دولت و سرمایہ قرار دے دیا گیا تھا۔ گو کاغذی طور پر لیگ ایک جمہوری ادارہ رہی لیکن جمہور کے صحیح نمائندوں کی آواز کسی وقت بھی اس نقار خانے میں موثر نہ ہو سکی۔ "قومی خدمت" کا معیار وہ تقریریں تھیں جو جلسہ ہائے عام میں کی جاتی تھیں یا وہ بیانات جو اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں غریب کارکنوں کی دسترس سے باہر تھیں۔ اُن کے پاس اس قدر سرمایہ نہ تھا کہ وہ ریل گاڑی کے اعلیٰ درجوں یا ہوائی جہازوں میں سفر کی صعوبت برداشت کر کے مختلف مقامات پر تقریروں کے لئے جا سکتے، نہ اُن کی دنیوی حیثیت اس قدر جاذب تھی کہ اخباری نمائندے ان کی جانب کھچے چلے آتے۔ اس محرومی کے سبب وہ "قوم کی خدمت" نہ کر سکے۔ لہٰذا تنظیمِ لیگ میں وہ کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔

سرمایہ کی کمی واقعی ایک ایسی رکاوٹ تھی جسے دُور کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ سالانہ

یا لیگ کونسل کے اجلاس میں ان کی شرکت ایک کٹھن منزل ہوتی تھی۔ اگرچہ انہی غریبوں میں ایسے ایسے "قلندر" بھی موجود تھے جنھوں نے لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے قمیصوں تک کو گروی رکھا۔

دولت وسرمایہ کے علاوہ اس محفل میں دوسرا معیارِ فضیلت انگریزی دانی تھا۔ قائدِ اعظم کی یہ مجبوری تھی کہ وہ اپنے دلی جذبات اردو زبان میں اُس بے تکلفی کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتے تھے جس طرح انگریزی زبان میں۔ آئینی وسیاسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرنے کی بجائے انھیں بزبانِ انگریزی ادا کر دینا زیادہ سہل تھا۔ اسمبلیوں اور دوسری کانفرنسوں میں ذریعۂ اظہار انگریزی تھا۔ اس رواج اور قائدِ اعظم کی مجبوری سے مجالسِ لیگ کی کارروائی بھی ساری یا بیشتر انگریزی میں ہوا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں انگریزی جاننے والوں اور انگریزی کا نہ سمجھنے والوں کا ایک محفل میں بیٹھنا دشوار یا بے معنی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں اول تو مجالسِ لیگ تک پہنچ ہی نہ سکے اور جو اس مقامِ بلند تک پہنچ سکے ان کے لئے

زبانِ یارِ من انگلش و من انگلش نمی دانم

کا حجاب حائل تھا جس سے ان کی حیثیت ایسی مجالس میں "غریب الدیار" کی سی رہ گئی۔ ہر چند شروع میں یہ چیز مصلحت کے پیشِ نظر کی گئی لیکن رفتہ رفتہ انگریزی ہی ذریعۂ اظہارِ خیالات بن گئی۔

لیگ میں متمول اور ذی ثروت حضرات کی شمولیت سے لیگ کو مالی تفکرات سے نجات مل گئی کیونکہ قائدین کے دورے میں "سوالِ کیسہ" حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریزی کے استعمال سے سہولت کار کے علاوہ وقت کی بچت بھی ہو گئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آئینی وسیاسی مسائل پر اظہارِ خیال جس بے تکلفی کے ساتھ انگریزی زبان میں ہو سکتا ہے اردو میں نہیں ہو سکتا۔ آزاد قوم کی زبان ہونے کی حیثیت سے انگریزی ایک "امیر" زبان ہے۔ اور اردو اس کے مقابلہ میں بہت بے مایہ ہے۔ وقتی طور پر لیگ کو ان دو عوامل سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ایک مستقل اور عظیم نقصان، مسلمانوں کی ملی تنظیم کو یہ ہوا کہ لیگ صرف "ضرورت کے" ارکان کی مجلس بن گئی۔ اور یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ "ضرورت کے ارکان" جو صاحبِ سرمایہ اور انگریزی داں تھے، اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو عوام سے قطعین کا بُعد رکھتا تھا۔ یہ بُعد جسمانی بھی

نہیں تھا، ذہنی بھی تھا۔ دونوں کی ضروریات و مقتضیات میں اختلاف تھا۔ دونوں کی نظر ایک نہ تھی۔ دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اور یہ بھی بالوضاحت کہا جا چکا ہے کہ لیگ کے یہ اربابِ اختیار اس جامد و ساکت گروہ سے نکلے تھے جو اب تک ہر قسم کی سیاسی تحاریک سے دُور ہی نہیں بلکہ بیرونی اقتدار کے اجیر کی حیثیت سے، ان کا مخالف بھی رہا تھا۔ قومی خدمت سے زیادہ ذہنی عیاشی ان کا منصب تھا۔ ان کی دلچسپی کے مراکز ضرور بدلے لیکن بنیادی چیز بدستور رہی۔ ان کی لندن و پیرس کی عشرت گاہیں قومی مجالس اور پلیٹ فارم میں منتقل ہو گئیں۔ وہ جہاں جاتے تھے ان کا شاہانہ خیر مقدم ہوتا تھا' زندہ باد کے نعرے لگتے تھے، گلے میں پھولوں کے ہار پڑتے تھے، تقریر سننے کے لئے ہزاروں اور لاکھوں عقید تمندوں کے اجتماعات ہوتے تھے۔ جس قوم کو وہ اپنے سابقہ اعمالِ سیاہ کی بدولت، منہ نہ دکھا سکتے تھے اُس میں یہ عزت و توقیر ـــ لوٹنے کی جائے ہے! یہ سودا کچھ کم نفع بخش نہ تھا۔ قوم میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لینے کے بعد وہ بآسانی اسمبلیوں کے ایوانوں تک بھی پہنچ گئے۔

غریب اور مخلص کارکن اس دوڑ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ادنیٰ رضا کار کی حیثیت سے دیہات کی خاک چھان سکتے تھے' وہ جلسوں کے اہتمام میں بے مُزد خادم کی حیثیت سے کھڑے رہ سکتے تھے، وہ جلسہ گاہ کی زیب و زینت کے لئے شب و روز ایک کر سکتے تھے' وہ آنے والے لیڈر کا سامان اپنے کندھے پر اٹھا سکتے تھے، وہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر زندہ باد کے نعرے لگا سکتے تھے' لیکن وہ لیگ کے نظام پر اثرانداز نہیں ہو سکتے تھے' وہ اپنے قائدین کو مشورہ نہیں دے سکتے تھے، ان کی رائے وقیع نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ انھیں اپنی رائے کے اظہار کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔ ان کی امیدوں کا سہارا بنتے؟ کے ایک قائدِ اعظم کی شخصیت تھی لیکن قائدِ اعظم کو ایک ایسے حلقے نے گھیر رکھا تھا کہ ان تک کسی "غیر" کی رسائی ممکن نہ تھی۔ قائدِ اعظم کو اکثر صحیح حالات اور قوم کے صحیح جذبات سے بے خبر رکھا جاتا تھا اور نہ ان تک صحیح حالات پہنچانے کی تمام راہیں بند تھیں۔ قائدِ اعظم خود ملنے میں بہت فیاض تھے لیکن ان سے ملاقات کا عمل اکثر ایسا پُرپیچ ہوتا تھا کہ قائد کی یہ فیاضی قوم کے کسی کام نہ آسکتی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ قائدِ اعظم ایک جگہ تشریف لے گئے۔ مقامی عمائدینِ لیگ نے یہ عذر پیش کر کے کہ قائدِ اعظم کی جان کو

خطرہ ہے اُن کی جائے قیام پر پہرہ لگا دیا۔ اس حفاظتی انتظام میں مخصوص لوگوں کو ہی رسائی کی اجازت تھی اور اس کے لئے بھی، شرط لگا دی گئی کہ جب تک کسی شخص کو لیگ کے فلاں ذمہ دار صاحب اجازت نامہ نہ دیں وہ قائدِ اعظم تک نہیں جا سکے گا۔ یہ "فلاں صاحب" اور دیگر مقامی عمائدینِ لیگ عموماً وہ رسوا ترین لوگ ہوتے تھے جن سے مخلص ارکان اور عوام متنفر ہوتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ قائدِ اعظم کو اُن کی سیاہ کاریوں سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ قائدِ اعظم تک پہنچ سکیں۔ قائدِ اعظم کو "سب ٹھیک" کہہ دیا جاتا تھا اور ان لوگوں کی سیادت کو کوئی زک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ان امیر لیڈروں کی تمام کارگذاری کا خلاصہ نکالا جائے تو اس سے زیادہ انھوں نے قوم اور لیگ کی کوئی خدمت نہیں کی کہ انھوں نے چند ایک سوالات پر قوم سے "ہاں" کرالی۔ مثلاً

کیا تم پاکستان چاہتے ہو؟ (ضرور چاہتے ہیں)

کیا تم پاکستان کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو؟ (بالکل تیار ہیں)

کیا تمہیں قائدِ اعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد ہے؟ (کامل اعتماد ہے)

حالانکہ یہ ایک بے معنی سی بات تھی۔ لیگ کے جلسوں میں اس قسم کی قراردادوں کی منظوری، کہ ہمیں قائدِ اعظم پر مکمل اعتماد ہے، ایک مذاق تھا۔ جب تک قائدِ اعظم لیگ کے صدر تھے اس وقت تک ان پر اعتماد کے اس رسمی اعلان کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ بہرحال یہ مذاق ہوتا رہا اور یاد رکھئے کہ یہ کوئی اتفاقی چیز نہ تھی اور نہ یہ قائدِ اعظم کی ذات سے کسی بے ساختہ عقیدت کا اظہار تھا بلکہ قوم پر یہ عملِ تنویم تھا تاکہ وہ ان مخصوص و محدود قراردادوں کے باہر کچھ نہ دیکھ سکے اور اسی بیچ میں الجھی رہے۔ ان لیڈروں نے "ایک جھنڈا، ایک پلیٹ فارم، ایک لیڈر" کے نعرے لگائے لیکن وہ خود جانتے تھے کہ اس کی حیثیت ایک نعرہ سے زیادہ نہیں۔

ان لوگوں نے لیگ سے یوں فائدہ اٹھایا۔ قائدِ اعظم نے ان لوگوں کو ملی مفاد کی خاطر یوں استعمال کیا کہ جب کبھی لیگ کے دعویٔ نمایندگی میں شک ہوتا تھا انھیں نشانے کے ہاتھی کی حیثیت سے پیش

کردیا جاتا تھا کہ دیکھو ایسے ایسے ذی اثر صاحب حیثیت آدمی لیگ کے ساتھ ہیں۔ وقتی طور پر یہ نمائشی تنظیم خوب کام دے گئی لیکن لیگ کسی وقت بھی ایک عوامی جماعت نہ بن سکی، نہ اس میں حقیقی تنظیم پیدا ہو سکی۔ اس نمائشی تنظیم کا جو حشر ہوا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ کاغذی گھروندا ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے کی بھی تاب نہ لاسکا۔ مصائب و آلام کا وہ قیامت خیز طوفان، جو تقسیم کے ساتھ ہی ہم پر اُمنڈ پڑا، خارجی عوامل سے کہیں زیادہ داخلی نظام کے کھوکھلے پن کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے اس عظیم قیامت میں اپنے آپ کو بالکل تنہا اور کس مپرسی کی حالت میں پایا۔ ان کی نظریں بے تابانہ اُن قائدین کو ڈھونڈتی تھیں جو اب تک مسلمانوں کی ملی سیاست کے ہر مرحلہ پر پیش پیش رہے اور جن کو قوم نے اسلام کے نام پر ووٹ دے کر اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا تھا۔ ملت کے یہ منتخب نمائندے اور قوم کے غم میں نڈھال ہونے والے لیڈر سب سے پہلے مشرقی پنجاب سے بھاگ گئے۔ ان کے غدارانہ فرار کے بعد غیر منظم و غیر مسلح مسلمانوں کا اس افراتفری کے عالم میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا اور بھاگ نکلنا قابلِ فہم ہے۔ جس جگہ کوئی ایک شخص بھی مسلمانوں کو یہ آواز دینے والا باقی رہا کہ "مسلمانو! ٹھہرو!!" وہاں انھوں نے جم کر مقابلہ کیا، اور وہ حملہ آوروں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ وہ غیرت مندوں، بہادروں اور شجاعوں کی موت مرے۔

دوسری طرف لاکھوں مسلمان اپنی لیگ اور لیگ کے لیڈروں کو پکارتے ہوئے سفاک دشمن کے ہاتھوں کٹ گئے یا افتاں وخیزاں پاکستان آپہنچے۔ پاکستان میں آکر بھی یہ پریشان روزگار مسلمان اس کانٹے کی پیہم چبھن محسوس کر رہے ہیں کہ یہاں کی لیگ اور لیگ لیڈر بھی ان کے درد کا درماں نہیں ہوسکتے۔ پاکستان کے لیگ لیڈروں میں اس قدر قیامت کے بعد بھی بیگانگی بڑھتی جارہی ہے۔ اب بھی وہ عوام کے قریب ہو کر ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر اس لئے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے کہ وہ ایک غیر حکومت کے زیر نگیں آچکے تھے جس کی نگاہ میں ان کے جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہ تھی۔ خود مغربی پنجاب میں غالب اکثریت میں اپنوں کی حکومت میں رہتے ہوئے بھی مسلمان اپنے آپ کو خستہ و خراب پاتے ہیں۔ مثلاً ضلع راولپنڈی میں مارچ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا یہ ایک طویل اور جگر گداز داستان ہے (اس کی تفصیل انشاء اللہ العزیز آئندہ فرصت میں پیش کی جائے گی۔) اب بھی، تمام

پاکستان کے بعد، وہاں یہ حالت ہے کہ عوام مایوس و افسردہ ہیں اور لیڈر اپنے حال میں مست ہیں۔ عوام کی افسردگی اور لیڈروں کی حال مستی کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے بخوبی ہو سکے گا۔

شروع اکتوبر ۱۹۴۶ء میں، پنجاب لیگ کے ایک بطلِ عظیم بحالیٔ امن کے دورے کے سلسلے میں گوجرخاں (ضلع راولپنڈی) تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اس روز جمعہ تھا۔ مسلمان لازمی طور پر توقع رکھتے تھے کہ یہ صاحب جو اسلام کا نام لے لے کر اس مقام تک پہنچے ہیں، نماز جمعہ میں شریک ہوں گے۔ لیکن انھوں نے غریب مسلمانوں کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھنا خلاف شان سمجھا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عین نمازِ جمعہ کے وقت ڈاک بنگلہ میں جلسہ کیا اور اس طرح کھلم کھلا شعائرِ اسلامی کا استخفاف کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد انہی کی جوڑ کے ایک اور قائد لیگ، غیر مسلموں کی بحالی کے جنون میں گوجرخاں گئے۔ اتفاق سے یہ بھی جمعہ کا روز تھا پہلے صاحب نے جامع مسجد سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر جلسہ کیا تھا لیکن انھوں نے جامع مسجد کے ساتھ ہی کچہری کے باہر جلسہ کیا۔ جلسے کے دوران میں مسجد میں اذان ہوئی۔ انھوں نے اذان کے احترام میں تقریر بند کردی۔ اذان ختم ہونے پر کلمہ بھی پڑا۔ پھر تقریر شروع کردی۔ دو بجے تقریر ختم کی۔ لیکن نماز جمعہ میں شریک ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ جلسہ گاہ جامع مسجد سے اتنے فاصلے پر تھی کہ امام کی قرأت وہاں صاف طور پر سنائی دیتی تھی۔

اے کاش ہمارے قائدین غریب عوام کے جذبات سے آگاہ ہونے کی بجائے ان کے بدلے ہوئے تیور ہی دیکھ لیتے جو ان کے پاس بیہودہ جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔

مسلم لیگ کو بحیثیت پارٹی ختم کر دیا جائے

مسلم لیگ کے سابق کارکن نے سطور بالا میں مسلم لیگ کی سابقہ تنظیمی خامیوں کا جائزہ لے کر آئندہ کیلئے اسے متنبہ کرنا چاہا ہے لیکن طلوع اسلام اس مسئلہ کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور وہ یہ ہے۔ ساری خامیوں کے باوصف مسلم لیگ نے ہمیں پاکستان دلوایا۔ یہ مسلم لیگ کی اہم ترین کامیابی اور پاکستان کی اہم ترین خامی ہے یہ مسلم لیگ سیاستیا کا رخ سوئے پاکستان موڑنے میں کامیاب ضرور ہو گئی لیکن وقت میں انقلاب پیدا نہ کر سکی اور نہ اسے دوسری منزل پاکستان تک لا سکی بلحاظ نظام

گرتے پڑتے پاکستان تک پہنچی، حالانکہ قائدِ ملت رواں دواں پہنچے۔ بہرکیف پاکستان اب زندہ حقیقت ہے اور اس سے ہمارے سیاسی تقاضے اور ملی مطالبے بدل جاتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد استحکامِ پاکستان مرکزِ سعی و عمل ہے۔ چونکہ ہمارا تصورِ پاکستان وطنیت کے عام سیاسی تصور سے جداگانہ ہے اس لئے ہماری ذمہ داری نہایت نازک اور اہم ہے۔ ہم فیصلہ کن دور میں ہیں۔ ہماری آئندہ تاریخ ملتِ پاکستانیہ ہی کی نہیں ملت انسانیہ کی تاریخ ہے۔ ہمارے آج کے عزائم، آج کے اعمال اور آج کے فیصلوں سے ترتیب پائے گی۔ پاکستان کی خاک کا ایک ایک ذرہ اس خورشیدِ حقیقت کا آئینہ بردار ہے کہ

کنتم خیرامۃ اخرجت للناس

اب تک مسلم لیگ برصغیرِ ہند کی متخاصم سیاسی جماعتوں میں کی ایک جماعت تھی۔ چونکہ اس کے نظریہ اور پیش نہاد سے اختلاف رکھنے والے گروہ ملت میں موجود تھے اس لئے ہندو اور انگریز کے مقابلہ میں رائج اور عام جمہوری ضوابط کے مطابق، اسے یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ ملت کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ بدیں غرض اسے انتخابی معرکوں سے دوچار ہونا اور دعویٔ نمایندگی ملت کا ثبوت مہیا کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ اسی الیشوع پر لڑے گئے کہ مسلمانانِ ہند پاکستان چاہتے ہیں اور مسلم لیگ کو اپنی واحد نمایندہ جماعت سمجھتے ہیں۔

اب پاکستانی مسلم لیگ اپنی تنظیمِ نو میں مصروف ہے۔ جیسا کہ اس کے نظام الاوقات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ بہت جلد ارکان کی بھرتی اور جماعتی انتخابی معرکے سے فارغ ہو جائے گی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنظیمِ نو سے مسلم لیگ کی کیا حیثیت ہوگی۔ اس وقت ہماری ضرورت انتخابی جیت نہیں کہ یہ تقاضے تقسیمِ ہند کے ساتھ ختم ہو لئے۔ اب ہمیں کسی غیر سے نہ پاکستان لینا ہے، نہ نمایندگی کا دعویٰ منوانا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اس حسین خواب کی عملی تعبیر کریں جسے سترہ سال پیشتر علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے دیکھا تھا اور جس کے لئے آپ نے دعا کی تھی:۔

نغمہ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

ہماری تگ و دو، قولی اور فعلی، یہی رہی کہ ہم ایسا قطعۂ ارض چاہتے ہیں جہاں نظامِ اسلام کو رائج و نافذ

کرسکیں۔ اب وہ قطعۂ ارض میسر آچکا ہے۔ اب ہمیں پرانے طریق کار کو جو حالاتِ گذشتہ میں بھی خام اور ناقص تھا، چھوڑ کر بدلے ہوئے حالات کے مطابق وہ لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا جو ہمارے پیش نہاد کے حصول کا ذریعہ ثابت ہو۔

آیئے دیکھیں کہ پاکستان مسلم لیگ کی ترتیب نو کیسے ہوگی۔ مسلم لیگ کا پہلا قدم ارکان کی بھرتی ہوگا (یہ کام ان دنوں شروع ہے) دستور و ضوابط کے مطابق پاکستان کا ہر مسلمان شہری جس کی عمر اٹھارہ سال ہوچکی ہوگی اس اعلان پر دستخط کرکے کہ "مجھے پاکستانی مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ہے اور میں اس کے قواعد و ضوابط کا پابند رہوں گا" اور دو آنے سالانہ چندہ ادا کرکے کسی ابتدائی لیگ کا رکن بن سکتا ہے ۔ پاکستانی مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ہر مسلمان کو اس اصل سے اتفاق ہے کہ پاکستان نظامِ قرآنی کی تجربہ گاہ ہے۔ پاکستان کی وحدت و استقلال درحقیقت نظامِ قرآن کے نفاذ کا ذریعہ ہے اور قرآنی نظام کا نفاذ مسلمان کا ایمان ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے اتفاق ہی نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی روح کی تمنائے بیتاب ہے۔ جو "مسلمان" اس اصول سے منحرف ہے وہ مسلمان نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر مسلمان اسلامی نظام کا تحفظ چاہتا ہے تو پھر یہ شرائط و میثاق رکنیت کیا معنی رکھتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ پاکستان کے ہر اٹھارہ سال کے مسلمان کو مسلم لیگ کا رکن بنالے گی؟ یہ ناممکن ہے۔ دنیا کی کوئی سیاسی جماعت آج تک اس معراجِ کمال کو نہیں پہنچ سکی۔ لیگ نے بہت بڑا تیر مارا تو پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے لاکھوں کو رکن بھرتی کرلے گی۔ تو کیا آئندہ حکومت صرف ان چند لاکھ کی نمائندہ ہوگی؟ ملت کی اکثریت جو کسی طور پر لیگ کی رکن نہیں ہوگی ان کی نمائندگی کون کرے گا؟ اکثریت کو نمائندگی سے محروم کرنا تو جمہوریت کے منافی ہے۔ جمہوریت اکثریت کو حقِ حکومت دیتی ہے۔ یہاں آپ اکثریت سے یہ حق چھین کر اقلیت کو دے رہے ہیں اور یہ فیصلہ آپ انہی اصولوں کے مطابق کررہے ہیں۔

جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ جو مسلمان مسلم لیگ کے رکن نہیں ہوں گے انہوں نے صرف رسم میثاق پوری ادا نہیں کی ہوگی ورنہ وہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں گے جس کی نمائندگی مسلم لیگ کرتی ہے۔ لیکن یہاں سوال مسلم لیگ سے نظری اتفاق کا نہیں بلکہ سوال ملت کو شریکِ حکم و حکومت کرنے کا ہے۔

مسلم لیگ کے عہدیدار، لہٰذا حکومت کے ارکان، صرف وہی لوگ ہو سکیں گے جو کسی نہ کسی ابتدائی لیگ کے رکن ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ جو حق پاکستان کے مسلمان کو صرف مسلمان ہونے سے حاصل ہے آپ وہ حق اس سے کیوں چھین رہے ہیں؟ اس مطلق حق کو مقید اور مشروط کیوں کر رہے ہیں؟ ایک مسلمان کے لئے یہ کیوں ضروری قرار دیا جا رہا ہے کہ وہ آپ کے فارم کی بھی خانہ پُری کرے۔ وہ پاکستان کا رہنے والا مسلمان ہے اور اس کا ایمان ہے کہ پاکستان کا استحکام برائے تنفیذ نظام قرآن ضروری ہے۔ لہٰذا اس ایمان کی بنا پر اسے تمام حقوق حاصل ہیں۔ پھر یہ مزید شرط کیسی؟

اس نظری حیثیت سے آگے بڑھ کر عملی حیثیت کی طرف آیئے۔ آپ نے کچھ لوگوں سے فارم پری کرا کے انھیں لیگ کا ممبر بنا لیا۔ باقی لوگ وہ رہ گئے جنھوں نے فارم نہیں بھرے۔ اب ظاہر ہے کہ جنھوں نے فارم نہیں بھرے وہ لیگ کے مقابل میں کسی پارٹی کے ممبر نہیں ہیں بلکہ محض وہ مسلمان ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے لیگ کے فارم نہیں بھرے۔ کل کو حکومت کے انتخابات کا وقت آئے گا۔ لیگ ایک شخص کو امیدوار قرار دیتی ہے۔ جن لوگوں نے لیگ کے فارم نہیں بھرے تھے ضروری نہیں کہ وہ اس شخص کی مخالفت کریں۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنی الگ پارٹی نہیں بنائی۔ یہ امیدوار خود ان کا بھی نمائندہ ہوگا۔ یہ اپنے میں اور اس میں کوئی فرق نہیں کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لیگ کی ممبری کے لئے خانہ پری کے یہ تکلفات سعی لاحاصل اور کوشش بے معنی ہیں۔ پاکستان کا ہر مسلمان، بجز ان بدبختوں کے (اگر کوئی ایسے ہیں) جن کے پیش نظر پاکستان کی تخریب ہے، پاکستان کی جماعتِ عظیم کا رکن ہے اور بلا تخصیص ہر حق کا مستحق۔ اس لئے لیگ کی رکنیت و عدم رکنیت بے معنی چیز ہو گئی۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانانِ پاکستان قرآنی نظامِ حکومت کی ترویج و تنفیذ چاہتے ہیں — اور جب تک وہ مسلمان ہیں وہ ایسا ہی چاہیں گے — تو کسی پارٹی کی طرف سے ان سے میثاق ہائے رکنیت پر کسی "عہدنامہ" کے بہانے سے ہی کیوں نہ ہو، کیوں دستخط لئے جائیں؟ جب کوئی مسلمان مسلم لیگ کے میثاقِ رکنیت پر دستخط کر دے گا تو اس میں کونسی اندرونی تبدیلی پیدا ہو جائیگی جو اس شخص میں مفقود ہوگی جس نے کسی وجہ سے اس میثاق پر دستخط نہیں کئے؟ حقیقی میثاق تو اس کا

ایمان ہے جو قلبی کیفیت و ایقان کا نام ہے۔ وہ کاغذی عہدناموں کا محتاج نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد اس ایمان کے جزئی نتائج ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اصل کو چھوڑ کر فرع پر "بیعت" کیوں لیں؟ کیوں نہ اسی اصل کو اجاگر کریں اور اسی سے تمسک کریں؟ یہ میثاق فالتو اور غیر ضروری پابندی ہے۔ پھر اگر یہ چیز محض غیر ضروری اور بے معنی ہی ہوتی تو ہم شاید اسے گوارا کر لیتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑے خطرہ کا موجب بن جائے گا۔ اس لئے کہ اس سے ایک سیاسی پارٹی تشکیل ہوتی ہے جس کے نتائج خطرناک ہیں۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اس وقت کسی وجہ سے فارموں پر دستخط نہیں کئے وہ کسی وقت خود ایک جداگانہ پارٹی بن کر لیگ کے حریف کی حیثیت سے فریقِ مقابل بن جائیں اور ملت اسی لعنت میں گرفتار ہو جائے جس میں آج اقوامِ مغرب بری طرح گھری ہوئی ہیں۔

حکومت چند انسانی دماغوں کے فیصلوں سے ترتیب پاتی ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ حسنِ نیت اور خلوصِ عزائم کے باوجود انسانی دماغ سے بہرحال غلطی کا امکان ہے اور چونکہ انسان اپنے اعمال پر خود تنقید نہیں کر سکتا اس لئے اس کے لئے یہ دیکھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک کے اعمال کا جائزہ لینے والا کوئی دوسرا ہو؟ اسی کو تنقیدِ صالحہ کہتے ہیں۔ جس کے بغیر کوئی نظامِ حکومت مستحکم و مرتفع نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے دنیاوی نظامِ جمہوریت میں حزبِ مخالف Opposition Party کے وجود کو ناگزیر سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان حکومتوں کے حزبِ مخالف اور قرآنی نظام کی جماعت محاسب میں ایک بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ ان حکومتوں میں حزبِ مخالف نام ہوتا ہے اس جماعت کا جو انتخاب میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اپنی حکومت مرتب نہ کر سکے اور اکثریت کی قائم کردہ حکومت کے مقابلہ میں ایک فریقِ مخالف کی حیثیت سے صف آرا ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت اس فریقِ مخالف کی تنقید اور مخالفت کے خوف سے ایسے عزائم و اعمال سے مجتنب رہنے کی کوشش کرتی ہے جس پر انگلی اٹھائی جا سکے اور اس طرح وہ ناقہ بے زمام نہیں ہونے پاتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس اصلاح کا جذبہ محرکہ تخویف و ترہیب ہو اس کا نتیجہ آئین و ضوابط کی لفظی پابندی تو ہوتی ہے، بشرفِ انسانیت کی بالیدگی نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی جس طرح خوفِ پاسبان سے چوری سے اجتناب شرافت و سعادت کا موجب نہیں بن سکتا۔

زندگی کے اس موڑ پر کہ ہم یہاں سے نئی اور صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں، ہم کیوں اسی راہ پر چلتے جائیں جس پر چلتے آئے ہیں اور جو ہمیں متعین منزل کے قریب تر لانے سے قاصر رہی ہے، اور جسے ہم قولاً ملعون قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہم باتیں تو کریں کعبہ کی اور راستہ اختیار کریں ترکستان کا؟ جیسا کہ طلوعِ اسلام میں اس حقیقت کو پیش کیا جا چکا ہے قرآن تواصی بالحق کا عدیم النظیر انداز اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، یعنی ایک دوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی تلقین کرنا۔ اس انداز محاسبہ میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک جماعت کا مستقل فریضہ کام کرنا ہو اور دوسری جماعت کا مستقل منصب تنقید و تنقیص۔ نظامِ قرآن میں، جماعت میں تقسیم کار کے ساتھ ساتھ اشتراکِ فرائض بھی رہتا ہے اور جماعت کے ارکان ایک دوسرے کے مددگار و معاون اور محاسب و ناقد بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نظام میں حزبِ حکومت اور حزبِ مخالف دو الگ الگ اور مستقل پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ ملت تقسیمِ عمل کی رو سے نظم و نسقِ حکومت کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے اور تبشیر و تنذیر کا بارِ عظیم بھی اٹھاتی ہے۔ ملت کے افراد ایک دوسرے کے اعمال کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور باہمد گر توصیق و صداقت کا اہم فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔

اس قرآنی اصول کی روشنی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجوزہ تشکیلِ جدید کا معائنہ کیجئے۔ مسلم لیگ نادانستہ طور پر ایک پارٹی کی حکومت قائم کر رہی ہے۔ یہی چیز مستحکم ہو کر فسطائیت میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی جو حکومت اس وقت ایک پارٹی تک محدود ہے وہ بالآخر ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ اگر اس کا نتیجہ شخصی آمریت نہ بھی ہوا تو حزبی آمریت Oligarchy تو ضرور ہو گا۔ اس سے مفر نہیں۔ اس طرح قوم کی اکثریت بتدریج حکومت سے دور ہوتی جائے گی۔ حکومت اور قوم میں پھر وہی بُعد اور خلا پیدا ہو جائے گا جو اب ہے۔ کیونکہ قوم کی اکثریت حکومت کو اپنی نہیں سمجھے گی۔ موجودہ خلا ایک حد تک ناگزیر ہے کیونکہ اس عبوری دور میں حکومت عوامی نہیں، لیکن آئندہ اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ملت کا ایک ایک فرد حکومت پر اثر انداز ہو، وہ ارکانِ حکومت چن سکے، ان کے اعمال پر تنقید و محاسبہ کر سکے اور بوقت ضرورت انھیں تبدیل بھی کر سکے۔ ایسی فضا پیدا کر دی جائے تو حکومت اور ملت معاون و مددگار ہو جائیں گی اور ان کی ربط باہمی کی متاعِ گم گشتہ پھر سے حاصل ہو جائے گی۔ اسی میں

پاکستان کا استقلال و تحفظ مضمر ہے۔

تواصی بالحق کی مطلوبہ فضا پیدا کرنے کے لئے صحیح لائحہ عمل یہ ہے کہ جداگانہ سیاسی جماعت کی پابندی سرے سے ہٹا دی جائے اور بجائے جماعت اور حکومت کے علیحدہ علیحدہ نمائندے چننے کے صرف حکومت کے نمائندے ہی چنے جائیں اور نظام اس قسم کا مدون کیا جائے کہ تواصی بالحق ـــ تنقید و تعاون ـــ خود بخود ہوتا رہے۔ مسلم لیگ کا جماعتی نظام تمام ملت پر نافذ نہیں کیا جا سکتا، یہ عملاً ناممکن ہے۔ اگر بغرضِ استدلال اسے ممکن تسلیم کر لیا جائے تو ملت پر دو نظام مسلط ہو جائیں گے، ایک مسلم لیگ کا دوسرا حکومت کا۔ نظام تو ایک ہی ہو سکتا ہے۔ فرد اور ملت کا ربط یہی ہے کہ فرد اپنی تمام صلاحیتیں ملت کے سپرد کر دے اور ملت ایسی فضا ـــ ایسا نظام ـــ پیدا کر دے کہ فرد ـــ ہر فرد نہ کہ رکنِ مسلم لیگ ـــ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا سکے۔ ہر فرد کو، عام اس سے کہ وہ کسی سیاسی جماعت کا رکن ہو یا نہ ہو، اظہارِ ذات و استحکام خودی کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ لہٰذا جب حیاتِ اجتماعیہ اپنی ہیئت حاکمہ (بطور مرکز) تشکل کر لیتی ہے تو کسی اور نظام و ہیئت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ مسلم لیگ کو بطور پارٹی ختم کر دیا جائے۔ قیامِ پاکستان تک تو اس پارٹی کی ضرورت تھی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں، کسی پارٹی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب سلطانیٔ جمہور کا وقت آگیا ہے۔ اب ان نقوش کہن کو مٹا دینا چاہئے۔ اور ان کا اللہ اور اس کے نیچے اس کے سب بندے۔ بس یہ ہے نظامِ جمہوریتِ اسلام۔

مسلم لیگ کے خاتمہ پر سوال تدوینِ نظام کا آتا ہے۔ یہ فریضہ حکومت کا بلکہ مجلس دستور ساز کا ہے۔ اس مجلس کو چاہئے کہ دستورِ اساسی بلا غیر ضروری تاخیر مرتب کرے اور ایسے خطوط پر مرتب کرے کہ ہر فردِ ملت حکومت کا معاون بھی ہو اور محاسب بھی۔ وہ کسی شہر میں بستا ہو یا گاؤں میں رہتا ہو، امیر ہو یا غریب، جزئیات میں آپ سے متفق ہو یا مخالف۔ البتہ مسلمان ہو ـــ اس مرکزی نظام میں منسلک ہو کر شریک حکم ہو جائے مرکزی نظام کی اساس فرد پر رکھنی چاہئے اور اسے تمام افرادِ ملت پر حاوی ہونا چاہئے۔ یہاں سوال نظام کی نوعیت یا اس کی اساس و جزئیات کے حسن و قبح کا نہیں بلکہ اس کی ہمہ گیریت کا ہے۔ ہر فرد اس سے متعلق ہو۔ دستور کا اثر ہر فرد پر ہو اور ہر فرد دستور کو متاثر کر سکے۔ یہ باہمی تاثر نظام کی زندگی اور تقویت کی دلیل ہے۔

ایسا نظام زندہ بھی ہوگا اور زندگی بخش بھی۔

پاکستان کی آبادی بیشتر دیہات پر مشتمل ہے۔ بیشتر دیہات ایسے ہیں کہ ان کے ساحل سے کسی سیاسی جماعت کی موجیں اب تک نہیں ٹکرا سکیں۔ وہ اور ان کی آبادی اتنی منتشر اور شہر اور شہریار سے دور ہے کہ سیاسی جماعتیں ان تک پہنچ نہیں سکتیں۔ حکومت کے قانون کا ان پر بہت کم اثر ہوتا ہے کہ ان سے لگان وغیرہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ وصول کر لیا جاتا ہے اور ان کی کوئی خلاف ورزی قانون کبھی اتفاق سے حکومت کے ایوانوں تک پہنچ جائے تو اس پر گرفت ہو جاتی ہے۔ وہ عام طور پر نظامِ حکومت سے غیر متعلق، غیر متاثر رہتے ہیں اور عام سیاسی تبدیلیوں کی نہ انہیں خبر ہوتی ہے، نہ وہ اس میں دلچسپی ہی لیتے ہیں، کیونکہ ان کے معمولاتِ زندگی ان تبدیلیوں سے مستغنی ہوتے ہیں۔ ان کو کسی نظام سے متعلق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تک پہنچا جائے اور انہیں موقع دیا جائے کہ مرکزی نظام کی حدود میں اپنے فرائضِ حیات سرانجام دیں۔ اپنی مشکلات اپنے حلقوں سے باہر ان حلقوں تک پہنچائیں جو اسی نظام کا حصہ ہیں لہٰذا ان کے ممد اور معاون ہیں۔ وہ اس نظام کو اپنی مقامی ضروریات کے مطابق ڈھالیں اور اپنی مقامی ضروریات کو مرکزی نظام کے تحت نپٹائیں۔

دیہات چونکہ منتشر ہیں اور بعض گاؤں برائے نام ہیں جن کی آبادی چند افراد پر مشتمل ہے۔ اس لئے بغرض سہولت ایسے کئی دیہات کا ایک انتظامی حلقہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسے ابتدائی حلقوں کے لئے ایک سو کی یا حسبِ ضرورت کم و بیش کی آبادی کی قید لگائی جا سکتی ہے۔ اس طرح دیہات میں انتظامی حلقے پیدا کر دیئے جائیں جو مقامی لوگوں کی خواہشات اور ان کی مقامی ضروریات کے مطابق مشترک امور کو حلقہ وار سرانجام دیں۔ ان ابتدائی حلقوں کے نمائندے ثانوی حلقوں میں جائیں جو ایسے کئی ابتدائی حلقوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ انتظامی تقاضوں کے مطابق ایسے حلقوں کا تعین دشوار نہیں۔ یہ حلقے پھیلتے پھیلتے شہر، ضلع، صوبہ، اور بالآخر مرکز تک آ سکتے ہیں۔ اس مربوط نظام سے مرکز کی حرکت کا اثر ایک ایک حلقہ پر پڑے گا اور ایک ایک حلقہ کی جنبش مرکز تک محسوس ہوگی۔

ابتدائی حلقہ Primary Unit میں ایک منتخب مجلس ہونی چاہیے۔ ارکان مجالس کا تعین ضرورت کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ یہ مجلس اپنے میں سب سے بہتر کو امیر، صدر، چن لے اور خود اس کی

مجلسِ شوریٰ ہو۔ ان انتخابات میں معیارِ فضیلت جوہرِ ذاتی، قوتِ عمل اور اتباعِ آئینِ خداوندی ہو نہ کہ دولت یا شخصی وجاہت و منصب۔ یہ مجلس مقامی امور باہمی مشاورت سے طے کرے۔ جن امور کا تعلق متعدد حلقوں سے ہو وہ ان حلقوں سے مشاورت کے بعد یا ثانوی حلقہ کی مجلس میں طے پائیں۔ یہی نظام ــــ امیر و مجلس شوریٰ ــــ ابتدا سے انتہا تک ہو۔ ہمارے موجودہ نظام میں سمال ٹاؤن کمیٹی، میونسپلٹی، کارپوریشن، اسمبلی وغیرہ ادارے ہیں۔ بڑے قصبوں، شہروں، ضلعوں، صوبوں اور مرکز میں تو یہ ادارے معروف عمل ہوتے ہیں لیکن گاؤں میں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو انھیں نظامِ حکومت سے مربوط و متعلق کر سکے۔ چنانچہ بڑے قصبوں سے نیچے جایئے تو حکومت کا بلدیاتی نظام ختم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کو یہاں ختم نہیں ہو جانا چاہیئے۔ اس نظام کے اس جگہ آکر رک جانے سے عوام کو اپنی پنچائتیں قائم کرنا پڑتی ہیں۔ ان کی حیثیت مقامی اور نجی ہوتی ہے اس لئے دیہات اور حکومت میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا اور اہالیانِ دیہات کا محورِ عمل مقامی تقاضے ہی رہ جاتے ہیں۔

ابتدائی حلقوں کے بعد بالائی حلقوں کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ مثلاً شہری، ضلعی، صوبائی، مرکزی وغیرہ۔ یہ انتخابات بالواسطہ بھی ہو سکتے ہیں اور بلا واسطہ بھی۔ مثلاً یا تو یوں کہ ہر زیریں حلقہ اپنی مجلس شوریٰ میں سے معین تعداد کے مطابق بالائی حلقے میں اپنے نمائندے بھیجے یا ہر حلقہ کے لئے انتخابی کالج Electoral College . جداگانہ ہوں۔ مثلاً ضلعی حلقہ کے لئے یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے متعلق حلقے اپنی اپنی مجلس شوریٰ میں سے طے شدہ تعداد کے مطابق نمائندے منتخب کر کے بھیج دیں یا سرے سے نئے انتخابات کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ آج کل ہوتے ہیں۔ ہم اول الذکر صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ امیر جمعہ مجلس شوریٰ اپنے حلقہ متعلقہ ( ) کی حکومت ہو۔ مرکزی حکومت امیر اعلیٰ ــــ صدر ــــ کابینہ اور مجلس شوریٰ ــــ جسے آج کل مجلس مقننہ کہتے ہیں ــــ سے مرکب ہو۔ ہر حلقہ کی مجلس شوریٰ امیر کی مشیر بھی ہو گی اور محاسب بھی۔ ہر امیر کی میعادِ امارت بھی مقرر ہونی چاہیئے۔ مثلاً تین سال۔ یہی میعاد مجلس شوریٰ کی ہو گی۔ مقررہ میعاد گزرنے کے بعد ہر حلقہ یعنی حلقہ ابتدائی سے لے کر مرکز تک انتخابات ہوں اور اہالیانِ حلقہ تجربہ و واقفیت کے مطابق شوریٰ منتخب کریں جو اپنے میں سے بہترین کو امیر چن لے۔ اس میعاد کے تعین کے ساتھ یہ گنجایش ضرور ہونی چاہیئے کہ اہالیانِ حلقہ جب چاہیں مجلس شوریٰ یا اس کے

کسی رکن کو بدل دیں یا مجلسِ شوریٰ امیر کو معزول کر سکے۔ یعنی جب بھی امیر، مجلسِ شوریٰ یا اس کا کوئی فرد ملی مفاد کے خلاف جائے تو اہلِ حلقہ اس پر قادر اور اس کے مجاز ہوں کہ یا تو اس کی اصلاح کر سکیں یا اسے بدل سکیں۔ اس طرح کوئی فرد خواہ وہ امیر ہو خواہ مجلسِ شوریٰ کا رکن، کسی حلقہ پر ارکانِ حلقہ کی منشاء کے برخلاف مسلط نہیں رہ سکے گا۔ یہ طریقہ وہی ہے جسے آئین جمہوری میں تحریک عدم اعتماد No Confidence Motion کہتے ہیں۔ اس طرح اختیار ناطق منتخب افراد کے ہاتھوں سے نکل کر ملت کے سپرد ہو جائے گا جو اس کا اصلی سرچشمہ اور گہوارہ ہے۔ وہ اجتماعی تقاضوں کے مطابق اس کا استعمال کرے گی۔ ایک نظام کے رائج کرنے کا یہ ایسا طریقہ ہے جس سے ساری کی ساری ملت متحرک ہوگی۔ وہ عمل بھی کرے گی اور محاسبہ نفس بھی۔ ایسی قوم

صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

کے مصداق تقدیر ساز ہی نہیں انسانیت کی تقدیر بن جائے گی۔[1]

وضاحت اور سہولت فہم کی غرض سے ہم ان گذارشات کا ملخص پیش کرتے ہیں:

مسلم لیگ کو بحیثیت پارٹی ختم کر دینا چاہیے۔ اسلامی نظام میں کسی پارٹی کی گنجائش نہیں جو حکومت کو صرف اپنے ارکان تک محدود رکھنا چاہے اور غیر ارکان کو حکومت سے بیدخل کر دے۔ کوئی ایک پارٹی جمہور کو ہمہ گیر نظام میں شریک نہیں کر سکتی۔ اس کا حلقہ اثر لامحالہ محدود ہوگا اور نتائج تباہ کن۔

نظامِ حکومت لاریب قرآنی ہوگا۔ (اس کی تدوین کی کیا صورت ہوگی اس کے لئے اشاعت زیرِ نظر کے لمعات اور علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "قرآنی تعلیم" ملاحظہ فرمائیے۔) حکومت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد نظام سے باہر نہ رہے۔ ہر فرد اپنی اقتدار اور صلاحیت کے بموجب نظام سے استفادہ کرے اور نظام از روئے عدل ہر فرد کو کما حقہٗ مستفید کرے۔ ایسے نظام کی ابتدا فرد سے ہونی چاہئے، سہولتِ نظم کے

---

[1] ہم نے یہاں محض اس اصول کی وضاحت کی ہے جس کے مطابق نظام "اجتماعی" کو اجتماعی اور ہمہ گیر بنایا جا سکتا ہے اور ہر فرد ملت کو اس میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک آئین و جزئیاتِ آئین کی تدوین کا تعلق ہے وہ مجلسِ دستور ساز کا فریضہ ہے اور ہمارے اس مبحث سے خارج۔

پیشِ نظر متفرق اور منتشر افراد کو انتظامی حلقوں سے متعلق کر دیا جائے۔ ہر حلقہ ایک مجلسِ شوریٰ منتخب کرے جو اپنے میں سے بہترین امیر کو منتخب کرے۔ ایک مجلسِ شوریٰ ــــ ابتدائی حلقہ سے مرکز تک ہر حلقہ کی مجلسِ شوریٰ ــــ ایک معینہ میعاد تک رہے۔ اس کے بعد انتخابات نو ہوں۔ انتخاب کا معیار جوہرِ ذاتی ہو اور اتباعِ آئین خداوندی نہ کہ دولت اور دولت کی وسیسہ کاریاں۔ انتخابات ایک معین عرصہ کے بعد ہوں لیکن اس درمیانی وقفہ میں ملت اپنے نمائندوں کا محاسبہ کرتی رہے اور جس پر عدمِ اعتماد ہو جائے اس کی بجائے اور نمائندہ چن لینے کی مجاز ہو۔ تاکہ بجائے اس کے کہ ملی لائحہ عمل سے منحرف نمائندہ یا نمائندہ مجلس کو معین عرصہ تک مسلط رہنے دیا جائے اس کے فتنہ کا فوری سدباب ہو جائے اور اسے بدل دیا جائے۔

اب تک ہم نے قرآنی نظام کے ہمہ گیر بنانے پر بحث کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظام کی ترویج پر صرف مسلمان متفق ہوں گے اور وہی اس نظام سے متعلق و متاثر ہوں گے۔ غیر مسلم اس نظام سے بداہتاً متعلق نہیں ہو سکتے۔ لیکن پاکستان میں غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اب تک جس وسیع پیمانہ پر جبری تبادلہ آبادی ہوا ہے اس سے پاکستان میں اقلیتوں کا تناسب بہت کم رہ گیا ہے۔ اس حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے کیونکہ کئی بزرگ اقلیتوں کے وجود کو بطور دلیل استعمال کر کے "غیر فرقہ وارانہ" جماعتوں کی تشکیل پر مصر ہیں۔ اسلام کا نظام فرقہ وارانہ تمیز اور تصور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظام کو غیر مسلم متاثر نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ اس نظام سے سرتابی نہ کریں تو اس کے فوائد انہیں ویسے ہی حاصل ہوں گے جس طرح کہ مسلمانوں کو حاصل ہوں گے۔ مثلاً اسلامی نظام میں فواحش اور دیگر جرائم کا کما ینبغی انسداد کیا جائے گا۔ عام معاشری فضا عدل و مساوات اور امن سے معمور ہو گی۔ اس فضا سے ہر وفادار شہری بلا لحاظ مذہب مستفید ہو گا۔ نظامِ قرآنی کو مسلمانوں تک محدود کرنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ غیر مسلموں پر کچھ اور قسم کی پابندیاں لگائی جائیں گی، یا انہیں بعض مراعات سے محروم رکھا جائے گا اور انہیں مخصوص دوائر میں محدود کر دیا جائے گا۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ ان پر کسی قسم کی غیر ضروری پابندی نہیں ہو گی۔ ان کے معابد محفوظ ہوں گے۔ وہ مذہب کی آزادانہ پابندی کر سکیں گے۔ ان کی زبان، معاشرت اور روایاتِ خصوصی کا پورا تحفظ ہو گا اور اس کے لئے مناسب آسانیاں مہیا کی جائیں گی۔ بلکہ ان کے خصوصی

فرقہ وارانہ حقوق کی نگہداشت بکمال انہی کے سپرد ہوگی۔ ان پر پابندی ان حدود کی ہوگی جنھیں ہم — یعنی خود حکومت — بھی توڑنے کی مجاز نہیں۔ ان کی فرقہ وارانہ آزادی وہیں مسلوب ہوگی جہاں وہ نظامِ حکومت و مصالحِ ملی سے متصادم ہوگی۔ ان کے مسائل خصوصی انہی کے نمائندوں کے سپرد ہوں گے جو مرکزی نظام کی حدود میں پوری آزادی سے انھیں سرانجام دے سکتے ہیں۔

اس آزادی کے بعد نام نہاد غیر فرقہ دارانہ اور مشترکہ جماعتوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مقامی مسائل مشترک میں اقلیتوں سے اشتراک کیا جا سکتا ہے یہ اشتراک بوجہ اشتراک مسائل خود بخود پیدا ہو جائے گا

چونکہ ہمارے ذہن اس کے عادی ہو چکے ہیں کہ سیاسی زندگی میں پارٹیوں کے وجود کو ناگزیر سمجھا جائے اس لئے ہماری یہ تجویز بالکل انوکھی اور غیر مانوس سی سمجھی جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ اسے صحیح طور پر سمجھنے میں بعض لوگوں کو دقت بھی محسوس ہو۔ بنابریں ضرورت ہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسے پورے غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جو خاکہ ہم نے پیش کیا ہے اس کے خط و خال یہ ہیں کہ

(۱) چونکہ پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کا نصب العین حیات ایک ہو چکا ہے (یا یوں کہئے کہ، ایک ہونا چاہیئے) یعنی مملکتِ پاکستان کا استحکام بدیں مقصد کہ یہاں قرآنی نظامِ زندگی رائج کیا جائے۔ اس لئے یہاں اب کسی پارٹی کی ضرورت نہیں۔ جو مسلمان اس مقصد کو اپنا نصب العین نہیں سمجھتا وہ پاکستان کا اور اسلام کا دشمن ہے۔

(۲) چونکہ پاکستان میں کسی پارٹی کی ضرورت نہیں اس لئے مسلم لیگ کی بھی ضرورت نہیں۔ تمام پاکستانی مسلمان، جو مذکورہ صدر مقصد کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں مسلم لیگی ہیں اور مسلم لیگی پاکستانی ہیں۔

(۳) چونکہ ملت اور حکومت دو جداگانہ چیزوں کا نام نہیں۔ اس لئے حکومت تمام ملت کی مشترکہ ہونی چاہیئے۔ کسی خاص پارٹی کی نہیں ہونی چاہیئے۔

(۴) اس نئے نظام کی ابتدا کرنے کے لئے، موجودہ مجلسِ دستور ساز کو چاہیئے کہ تمام ملک میں

عمومی انتخابات کا انتظام کرے۔ مثلاً ہر سو افراد پر ایک نمائندہ۔

(۵) یہ نظام دیہات سے شروع کیا جائے۔ ہر سو افراد پر ایک نمائندہ۔ اگر ایک گاؤں کی آبادی سو سے کم ہے تو اُسے دوسرے گاؤں کے ساتھ ملا دیا جائے۔ اس طرح پر ہزار افراد کے دس نمائندے ہو جائیں گے۔ ان دس نمائندوں کا ایک حلقہ بنا دیا جائے۔ یہ اپنے حلقہ میں ملت کے ترجمان ہوں گے۔ اسی طرح شہروں میں کیجئے۔

(۶) ایک تحصیل کے دیہات اور شہروں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، اس تحصیل کا نمائندہ قرار پا جائے گا۔

(۷) ایک ضلع کی تمام تحصیلوں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، اس ضلع کا نمائندہ حلقہ ہوگا۔

(۸) مختلف اضلاع کے نمائندوں کا دسواں حصہ، صوبہ کی نمائندہ جماعت بن جائے گا۔ اور

(۹) تمام صوبوں کے نمائندوں کا دسواں حصہ، مرکزی جماعت۔

نوٹ: دسواں حصہ ہم نے مثال کے طور پر کہا ہے۔ عملی طور پر جیسا بھی مناسب سمجھا جائے کر لیا جا سکتا ہے۔

(۱۰) خدامِ ملت کا یہ نمائندہ گروہ، اپنے میں سے امیر اور اس کے اعیان و رفقا کا انتخاب کرے۔ یہ ہماری مرکزی حکومت بن جائے گی۔ جو نمائندے باقی بچیں، وہ امیر کی مجلسِ شوریٰ۔ یا ہماری مقننہ جماعت ہوگی۔ اسی طرح صوبائی حکومتوں کی تشکیل ہو جائے گی۔ ضلعوں تحصیلوں اور ابتدائی حلقوں میں، یہی نمائندے، ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپل کمیٹی اور ابتدائی حلقوں کی انتظامی کمیٹیوں کے اراکان قرار پا جائیں گے۔

یہ تمام ارکان، اپنے اپنے حلقوں میں (ابتدا سے لے کر مرکز تک) عمال حکومت کے نگران و محتسب ہوں گے۔

اس طرح ایک فرد ملت سے لیکر امیرِ ملت تک ایک صحیح جمہوری، اسلامی، نظام کی تشکیل ہو جائیگی۔ یہ نظام، پاکستان کے لئے دستور کس طرح وضع اور نافذ کرے گا۔ اس کا مختصر سا خاکہ اسی اشاعت کے لمعات میں پیش کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیل وقتاً فوقتاً طلوع اسلام کے صفحات پر ہوتی رہے گی۔

یہ ہے وہ خاکہ جسے ہم صحیح جمہوری اور اسلامی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ نے مسلم لیگ قائم کر لی تو یہ ایک پارٹی بن جائے گی جس کے مقابلہ میں اور پارٹیاں بھی بن سکیں گی اور ملت پھر پارٹی بازی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گی۔ پھر انتخابی معرکوں میں وہی سر پھٹول ہوا کرے گی اور پھر شکست خوردہ پارٹی، برسر اقتدار پارٹی کو شکست دینے کے لئے سرگرم عمل رہا کرے گی اور اس طرح ملت کی تمام قوتیں اسی رسہ کشی میں صرف ہو جائیں گی۔ اور اس کا وجود، پارٹیوں کی نذر ہو جائے گا۔

پاکستان میں پارٹیوں کا وجود ختم کر دینے سے فقط ملت باقی رہ جائے گی اور ملت کے بہترین افراد اس کے نمائندہ ہوں گے۔ نمائندوں کے انتخاب میں، معیار انتخاب امیدواروں کے جوہر ذاتی ہوں گے نہ کہ پارٹی کے لیبل۔ اس طرح پارٹی بازی کے جہنم سے نکل کر، ہم ملت واحدہ کی جنت کی طرف آ سکیں گے۔

وذالك الفوز العظيم۔

قرآن کے ابدی حقائق از جناب پرویز کا حقیقت نگار قلم

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

جو اس اصل کے ماتحت مرتب کی گئی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے

اور تکمیل شرف انسانیت کیلئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم کو سمجھنے کیلئے

اس قسم کی کوئی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آپکو نہ ملیگی

جلد اول خدا پر ایمان، ارتقائے شرف انسانیت اور امن و سلامتی عالم کے لئے کیوں ضروری ہے۔ بڑی تقطیع صفحات چھ سو۔ قیمت مجلد دس روپے۔

جلد دوم نظریہ ارتقاء۔ آویزش ابلیس و آدم۔ ملائکہ اور جنات کی حقیقت۔ وحی کی ضرورت مقام رسالت۔ پونے پانچ سو صفحات۔ قیمت مجلد دس روپے

جلد سوم آسمانی انقلاب کی بصیرت افروز و حقیقت کشا تاریخ۔ از معمار حرم حضرت خلیل اکبر تا خاتم انبیائے بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ۔ حجم سوا سات سو صفحات۔ قیمت مجلد پندرہ روپے

مکمل سیٹ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اس لئے جلدی طلب فرمائیے۔

(خرچ ڈاک ہر سہ جلد تین روپے)

ناظم دار الاشاعت معارف القرآن

۲۳/۸ فاؤلرز لائن۔ نیپیئر بارکس۔ کراچی

آزاد پاکستان میں پہلا یومِ اقبال

"تقدیرِ امم" ——— طاؤس و رباب سے نہیں، شمشیر و سنان سے بنتی ہے۔ روحِ قومی تلواروں کی جھنکار پر رقص کرتی ہے اور طاؤس و رباب اسے سلا دیتے ہیں۔ تھکی ہوئی اور ہزیمت خوردہ قومیں جنگِ حیات سے فرار کی راہ اختیار کرتی ہیں تو وہ وادیٔ طاؤس و رباب کی طرف بھاگتی ہیں۔ یہی ان کی موت ہوتی ہے۔ رزم و پیکار کے میدانوں میں قومیں شکست کھا سکتی ہیں، مر نہیں سکتیں۔ لیکن جب ان کے کان طبلِ جنگ سے نفور ہو کر نوائے چنگ سے مانوس ہونے لگ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ قوم ہلاکت کے جہنم میں گری۔ اسی نوائے چنگ کا دوسرا نام شاعری ہے جسے قرآن نے راہ گم کردہ قوموں کا شیوہ بتایا ہے۔

اقبال اپنی ملت خوابیدہ کو پیغامِ حیات دینا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان پر یہ عظیم القدر راز افشا کر دیا تھا کہ

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

اقبال کا خطاب انسان سے تھا لیکن سب سے پہلے ان کے پیشِ نظر خوابیدہ مشرق تھا چنانچہ یہ پیغام پوری طرح قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کے لئے اقبال نے مزاجِ مشرق کے مطابق نظم کو ذریعہ بیان منتخب کیا۔ چونکہ فطرت کی کرم گستریوں نے طبع میں موزونیت نہایت بلند و دیعت کی تھی اس لئے وہ اپنی مخصوص اور غیر معمولی افتادِ طبع سے اس میدان میں دیگر رفقائے شعر کو ہزاروں فرسنگ پیچھے چھوڑ گئے۔ چنانچہ محض شعریت کی جہت سے بھی مطالعہ کیا جائے تو کلامِ اقبال چاشنی اور لطافت میں بے نظیر اور یکتا ہے۔ نظم کو اظہارِ بیان کا ذریعہ اختیار کرتے ہوئے اقبال بے خبر نہ تھے کہ طبعِ مشرق ذریعہ کو مقصود سمجھ لیا کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے قدم قدم پر

یاد دہانی کرائی کہ ان کا مقصد شاعری نہیں بلکہ وہ ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اس موہبتِ عظمیٰ کو جہانِ چار سو میں عام کر دینا چاہتے تھے کہ جن کا مہبط ان کا قلب تھا۔

اقبال کا مقصد شاعری ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ان کا سرچشمۂ فکر قرآن تھا جو ان کے قلب و دماغ دونوں کو اپنی نورانیت میں گھیرے ہوئے تھا، وہی چشمۂ حیات، مصفا اور مقطر، جو ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر حرا کے غار سے پھوٹا تھا۔ وہ شاعری کو مقصد بنا لیتے تو حقیقت "لفظ و صوت" میں کھو جاتی۔ قرآن زندگی کا درس دیتا ہے۔ اس نے نبی کے کلام، یعنی آیاتِ الٰہی سے متعلق صاف صاف کہا کہ "ما ھو بقول شاعر" یہ کسی شاعر کی تخئیل آرائی نہیں، قوموں کی زندگی اور موت کی ابدی، لافانی حقیقتیں ہیں۔ قرآن نے نہ محض اپنے آپ کو الزامِ شاعری سے مبرا کیا بلکہ شاعروں کی اتباع سے اس طرح منع فرمایا کہ الشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الغَاوٗن۔ یعنی شاعروں کی اتباع گمراہ کرتے ہیں۔ شاعری اور زندگی دو متضاد چیزیں ہیں۔ بقول اقبال

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

"اسرار و رموز" کی اشاعت پہلی عالمگیر جنگ سے پیشتر یعنی ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔ اس میں اقبال نے اپنا فلسفۂ حیات مربوط شکل میں پیش کیا اور آغازِ سفر میں ہی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ وہ جو کچھ شعر کے لباس میں پیش کر رہے ہیں وہ دراصل شعر نہیں بلکہ شاعری سے ماوراء ہے وہ خونِ جگر سے لکھا ہوا فلسفۂ زندگی ہے۔ جس کے بغیر عشق جو حیات کی اساس ہی نہیں اس کی نمود کا ضامن بھی ہے، سودائے خام بن کے رہ جاتا ہے چنانچہ وہ اپنے نغمہ کو اس "جہان" کا نہیں سمجھتے۔

نغمۂ من از جہانِ دیگر است　　　این جرس را کاروانِ دیگر است

یہ نغمہ جہانِ شاعری کا طلسم لفظ و صوت نہیں بلکہ کاروانِ حیات کی بانگِ درا ہے لہٰذا اس کا مقصد یہ ہے:۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اقبال کے نزدیک شاعر کا مقام "دیدہ بینائے قوم" ہے جو

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

شاعری کا عیار حیات ہے اور اقبال حیات سے حیاتِ اجتماعی مراد لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے نزدیک شاعری تفریح و تفنن کا سامان نہیں بلکہ پیغمبری کا جزء ہے جو حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی تشکیلِ نو کی داعی ہے۔ چونکہ اقبال کی نگاہ میں شاعر دیدہ بینائے قوم ہے اس لئے وہ یہ احساس رکھتے ہوئے کہ شاعری گل و بلبل کی رنگینیوں اور خوش نوائیوں میں الجھ کے رہ جاتی ہے اپنے اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔

یارب درون سینہ دل با خبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

وہ شاعروں کی طرح حدیث جام و مینا تک محدود نہیں رہ سکتے بلکہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر "ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا" تلاش کرتے ہیں۔ اقبال کا کلام شروع سے ہی "جہانِ دیگر" کا نغمہ تھا لیکن ان کا فکر جوں جوں 'رنگ و آب شاعری' کی منزل سے آگے بڑھتا اور حیات کی عقدہ کشائی میں جذب ہوتا گیا اور اس طرح انھیں یقین ہوتا گیا کہ

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

تو آغازِ سفر میں ہی آپ نے "بحضور رحمۃ اللعالمینؐ" یہ عرض کی:

گر دلم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور — چشم تو بیناند و ما فی الصدور
پردہ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
خشک گرداں بادہ در انگور من — زہر ریز اندر مے کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

آغازِ سفر میں ہی آپ نے یہ عہد کیا اور رحمۃ اللعالمینؐ کو اس پر گواہ بنایا کہ ان کا کلام قرآن کا ترجمان ہوگا۔

اگر خدانخواستہ انہوں نے ایسا نہ کیا تو انہوں نے خود اپنے آپ پر لعنت کی یہ آخری حد بطور سزا تجویز کی کہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

"روزِ محشر" انسانی حیاتِ جاوداں میں ایک فیصلہ کن روز کا نام ہے۔ اس روز انسانیت ارتقائی شاہراہ کے اس موڑ پر سے مڑ رہی ہوگی جو الیٰ ربک منتہاھا کی منزل کا صراطِ مستقیم ہے۔ "رحمۃ اللعالمین" انسانیت کے مثالی نمونہ ہیں۔ انسان، انسان ہے "تلاشِ مصطفےٰ" سے اور اسے "بہا" حاصل ہے "نام مصطفےٰ" سے۔ "مصطفےٰ" انسانیت کے جسم سے نکال دیجئے تو انسانیت جسدِ بے روح ہے۔ انسانیت باطل۔ ساری زندگی باطل۔

میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

جس جرم کے لئے اقبال رحمۃ اللعالمین کے حضور روزِ محشر، لعنت کی آخری حد بطور تعزیر تجویز کرتے ہیں وہ جرم ظاہر ہے کہ کس قدر خلافِ انسانیت ہوگا، ایسا جرم جس کی بخشش نہیں۔ یہ جرم یہی تھا کہ ان کا پیغام شاعری ہو جائے اور قرآن کا عکس نہ رہے۔

ملتِ اسلامیہ صدیوں سے اس حال میں تھی کہ

دل زندہ ہوں جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

مسلمان سے جب سے رشتۂ قرآن چھوٹا ہے اس کے ہاں شاعری شاعر پیدا ہوتے رہے جو گاگا کر اسے اور سلاتے گئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں شاعر، بساطِ حیات کے ہر گوشے پر شاعر۔ اس قوم میں صدیوں سے کوئی ایسا درویش نہیں اٹھا تھا جو اس کے عروقِ مردہ میں زندگی کا خون دوڑاتا اور اسے زندگی کے تقاضوں کا احساس دلاتا۔ جب کلکِ ازل کا لکھا پورا ہونے کا وقت آیا اور اقبال نے "اپنے زخمِ پنہاں" کے لہو سے "محفل کو گلستاں" کر دینے، اپنے "سوزِ پنہاں" سے "ہر شمعِ دل کو جلا کر تاریک راتوں میں چراغاں کر دینے اور جہان کو وہ کچھ دکھا دینے کا تہیہ کر لیا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا تو اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا کہ

زمرغانِ چمن ناآشنائیم بشاخِ آشیاں تنہا سرائیم

لیکن ان کا فکر اتنا پختہ اور انہیں اپنے مقصد کی صداقت کا ایسا یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس 'تنہا سرائی' سے رُکے نہیں اور اپنے سامع کو انتباہ کیا کہ

اگر نازک دلی از من گراں گیر
کہ خوتم می تراود از نوائیم

اپنے 'سامع' — شریکِ سفر — کو مزید انتباہ کرتے ہیں۔

ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

وہ جانتے تھے کہ ہمراہان سست عناصر ان کے آشوب و غوغا کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ ان کا مسلک جداگانہ — انوکھا — تھا۔ ان کی آرزو نئی تھی۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو است
با من میا کہ مسلک شبیرم آرزو است

ہمراہیوں کو وہ بار بار آگاہ کرتے ہیں تاکہ وہ غلط فہمی میں نہ رہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ ہمراہی یونہی حسبِ عادت ان کو بھی ایک 'تیز رو' سمجھ کر ان کے ساتھ ہو لیں۔ وہ مستقل ہم سفر چاہتے تھے یا پھر تنہا ہی رہنا چاہتے تھے۔ 'یارانِ محرم' میسر نہ آئیں تو 'غریب' رہنا اولیٰ ہے۔ اقبال کو 'غریب' ہونے کا ہمیشہ احساس رہا۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم — کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غم خود را بگویم با دلِ خویش — چہ معصومانہ غربت را فریبم

بہار آ پہنچتی ہے اور 'گل نخستیں' چمن میں کوئی ہم نفس نہیں دیکھتا تو

بہ آ بجو نگرم خویش را نظارہ کنم
بایں بہانہ نگر روئے دیگرے بینم

اقبال نے ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لانے کے لئے ساز سخن کا بہانہ بنایا تو اس نوا کو بہت کم سمجھا گیا۔ چنانچہ انھیں کہنا پڑا:

زخود رمیدہ چہ داند نوائے من زکجاست
جہانِ او دگر است و جہانِ من دگر است

وہ کسی اور جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا مصرع 'قطرۂ خون' سے تھا اور سننے والے حدیثِ دلبری کے منتظر تھے۔ وہ اپنی نگاہ کی گردش سے رستاخیز برپا کر رہے تھے اور ان کی ملت ایسی متاعِ بے بہا کی خریدار نہیں تھی۔ ان کی مخاطب صدیوں سے خوابیدہ ملت تھی جس پر بیداری کے تقاضے بغایت گراں تھے۔ وہ تھپکی اور لوری کی طلب گار تھی نہ کہ صورِ اسرافیل کی۔

اقبال کا احساس شدید ہوتا گیا۔ ان کا افلاک سیر فکر تقدیر کے پردوں کو چاک کرتا گیا۔ وہ بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ ان کا احساس دوگونہ تھا۔ احساسِ ہنر اور احساسِ تنہا سرائی۔ چنانچہ جیسا کہ کہا ہے:

از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند   در دیارِ ہند خوارم کردہ اند

اور

نوا ز حوصلۂ دوستاں بلند تر است   غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نہ شنید

کم ظرف "دوست" رعشہ دار ہاتھوں میں فکرِ اقبال کا ساغرِ لبریز سنبھال سکنے کے اہل نہیں تھے۔ اقبال نے 'حضورِ حق' یہ التجا کی،

مئے من از تنک جاماں نگہ دار   شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار
شرار از نیستانے دور تر بہ   بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

یہ مے "تنک جاموں" اور "عوام" کے لئے نہ تھی۔ یہ شرار طاغوتی ظلمت سے نکال کر وادی نورِ الٰہی کی طرف لے جانے کا ضامن تھا۔ اسے اس نیستان میں ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ملت کی انجمن شعلہ آشاموں سے خالی تھی، یہاں آتش بجامِ ساقی کا کیا کام!

۱۰ راگست ۱۹۳۵ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک مراسلہ میں اقبال لکھتے ہیں:

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں، اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں

جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کرلیا ہو

ورنہ

زمینی خیر ازاں مردے فرودست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

اپنی مے بے درد و صاف کو اقبال نے عمر بھر بے درد و صاف رکھا تا آنکہ وہ وقت آگیا کہ

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک

تو

ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت واز کجا بود

ارمغانِ حجاز کہ علامہ مرحوم کا آخری مجموعہ کلام ہے آپ کا "سفرِ حج" تھا۔ مادی سفرِ حج نہیں بلکہ منزلِ دوست کی طرف قلبی سفر منزلِ حجاز، مرکزِ انسانیت! اور دوست، معراجِ انسانیت!! اقبال جب بھی فریاد کرتے ہیں تو وہ رسول کا دامن پکڑتے ہیں اور آنکھوں اور دل سے لگاتے ہیں "نگاہے یارسول اللہ نگاہے"۔ یہی ان کی طمانیتِ روح ہے۔ ان کی آنکھوں کی بصارت، اور قلب کی بصیرت، بصیری کو خواب میں ردا بخشنے والے کے دم سے ہے۔ اقبال بصیری کا خواب کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ان کا کلام اس خواب کی تعبیر ہے۔ وہ "حضورِ حق" کوئی شکایت نہیں کرتے، وہ "رسالت" سے ہی دادخواہ ہوتے ہیں اور بیان کی انتہا ہے۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ان پر واشگاف ہو چکی تھی کہ انسانیت کے افرادِ منتشرہ ایک کارواں کی شکل ہمیشہ رسالت کی وساطت سے اختیار کرتے ہیں۔ اس سفر میں بھی وہ "حضورِ رسالت" پہنچ کر رسول کے دامن کو وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ بناتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

اقبال کوئی ذاتی خواہش نہیں کرتے۔ انھیں ایک ہی غم ہے اور وہ یہ کہ انھیں "مثالِ شاعراں" افسانہ بست

سمجھا جا رہا ہے۔ ان کی گفتار "ماورائے شاعری" ہے مگر جسے محض شاعری سمجھا جا رہا ہے۔ وہ یہ تہمت گوارا نہیں کر سکتے اور اس پر رسول کو شاہد بناتے ہیں اور رسول سے ہی دادخواہ ہوتے ہیں۔ اقبال کو جو قلبی عشق رسول کی ذات سے تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں اقبال کی صحبت میسر آئی ہے یا جو الفاظ کے پردوں سے آگے نکل کر ان کے کلام کو سمجھ سکے ہیں۔ ان کی زندگی، ان کے کلام کا نقطہ ماسکہ یہی عشق تھا۔ اس عشق کی شدت اور گہرائی کے تناسب سے ان کی دادخواہی کی شدت اور گہرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اقبال کی فریاد کی یہ صدا آخری ہے۔ دیکھئے وہ کس طرح خون کے آنسو بہا کر عرض کرتے ہیں کہ

من اے میر امم داد از تو خواہم

مرا یاراں غزل خوانے شمردند

"کتنا بڑا ظلم ہے مجھ پہ کہ ــــ مرا یاراں غزل خوانے شمردند"

اقبال عمر بھر یہی کہتے رہے اور یہی کہتے ہوئے انھوں نے اس دنیا سے اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ لیکن ابھی ان کی آنکھیں بھی بند نہ ہوئی ہوں گی کہ آواز آئی ــــ آہ شاعرِ مشرق مرد ــــ حساس قلوب میں اسی وقت دھڑکن پیدا ہو گئی کہ جو غلط فہمی وہ عمر بھر رفع کرتے رہے، قوم اس وقت تک اُسی میں مبتلا ہے۔ جس تہمت سے وہ زندگی بھر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے رہے، ان کے مداحین نے ان کے مرنے کے بعد بھی انھیں اس سے نہ بچنے دیا۔ یہ کچھ ہوتا رہا، تا آنکہ ہم اس سال آزاد پاکستان میں آپہنچے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کا "یومِ اقبال" آزاد پاکستان کا پہلا یومِ اقبال ہے۔ اس اقبال کی یادگار کا دن جس نے کاروانِ راہ گم کردہ کو نشانِ منزل عطا کیا۔ اگر اقبال نے ملت کی تطہیرِ فکر نہ کی ہوتی اور انھیں تصورِ پاکستان نہ دیا ہوتا تو آج ہم آزاد ہندوستان میں چند مخصوص نشستوں کے بھکاریوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتے اور ہمارا وہی حشر ہو رہا ہوتا جو وہاں رہ جانے والے مسلمانوں کا ہو رہا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ پاکستان میں اس محسنِ اعظم کی وفات کی پہلی برسی آئی تھی۔ اس پاکستان میں جس کی حکومت نے، ہولی، شورا تری، حتیٰ کہ گورو گوبند سنگھ کے جنم دن تک کو عوامی تعطیل قرار دے رکھا ہے۔ اس پاکستان میں حکومت کی طرف سے یومِ اقبال کے انعقاد کا انتظام تو ایک طرف، اس یادگار میں ایک دن کی تعطیل تک نہ قرار دی گئی[1]۔ طلوعِ اسلام کا یہ مطالبہ کہ بانی تصورِ پاکستان کا

[1] اشاعتِ رواں میں "۲۱ اپریل" کے عنوان والا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

یوم وفات، ملی یادگار قرار دی جائے، شائستہ اعتنا نہ سمجھا گیا — سچ ہے اس سلطنتِ عظمیٰ کے رفیع القدر ایوانوں تک "درویش و فقیر" کی رسائی ناممکن ہے۔ خواہ اس درویش کی فغاں سے کعبہ و سومنات تک میں رستاخیز اور اس کی نوائے شور سے حریمِ ذات تک میں شور کیوں نہ برپا ہو گیا ہو۔

حکومت کی اس کوتاہی کو البتہ "غیر حکومتی" حلقوں میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان کے مرکز — کراچی — میں کسی "بزمِ اقبال" کی طرف سے یوم اقبال کے انعقاد کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ہم بڑے شوق سے منتظر تھے کہ اس تقریب کے پروگرام کی تفصیل سامنے آئے۔ ۱۶ر اپریل کے ڈان میں اس کا پروگرام شائع ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔

۲۱ر اپریل — ختم قرآن برائے ایصال ثواب	۲۲ر اپریل — تقاریر
۲۳ر اپریل — قوالی۔	۲۴ر اپریل — شاعرہ

انا للہ وانا الیہ راجعون

قوالی — مشاعرہ!! جسے اقبال زندگی بھر قوم کے لئے افیون[1] قرار دیتے رہے اسی کو ان کی یاد میں روا رکھا جا رہا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں اقبال نے کہا ہے۔

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

۱۹۳۸ء سے پیشتر ہی نہیں (کہ وہ ارمغانِ حجاز کا سالِ اشاعت ہے) بلکہ اس کے دس سال بعد تک بھی اقبال کی یہ بات اسی قدر سچی ہے جس قدر کہ اس وقت تھی۔ ذہنِ ملت کی اس وقت تک یہ کیفیت ہے کہ وہ یہ جان نہیں سکا کہ

"ایں مسافر"

چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اس بزمِ اقبال کے بیشتر افراد شاید اقبال کو ذاتی طور پر بھی جانتے ہوں۔ صدر بزمِ اقبال، علم الدین صاحب، کہ جن کی طرف سے مذکورہ صدر اشتہار شائع ہوا ہے، کراچی میں کلکٹر اوف کسٹمز ہیں۔ شاید یہ خود بھی انہی کے زمرہ

---

[1] ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے عنوان کے تحت ارشاد ہے۔

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی — ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

میں شامل ہوں جو اقبال کو ذاتی طور پر جانتے ہیں)۔ اس بنا پر یہ لوگ محفل میں نہایت فخر سے کہتے ہوں گے کہ "بابا آشنا بود" لیکن آہ! کتنی افسوسناک ہے یہ حقیقت کہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھا کہ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال کا تذکرہ کرنا اور قوالوں کے ذریعے سے ان کی یاد منانا، اقبال سے اظہارِ عقیدت نہیں بلکہ ان کی روح کو دکھ دینا ہے۔

ملت کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے کہ اقبال نے قیصر و کسریٰ کی عظمتیں ان کے قدموں کے نیچے رکھنا چاہیں لیکن وہ آب و رنگِ شاعری ہی کے لئے مصر رہی۔ اس نے ظاہری اقبال کو دیکھا اور اس کی حقیقت سے بے خبر رہی۔

کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید آشکارم دید و پنہانم نہ دید

ملتِ اسلامیہ نے جس روز اقبال کی حقیقت کو سمجھ لیا وہ تاریخ انسانی کا فیصلہ کن روز ہوگا کہ اقبال کی حقیقت کو سمجھنا دین کو سمجھنے کے مرادف ہے۔ اور اس باب میں ملت کی ابھی یہ حالت ہے کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ

ورنہ، آج اقبال کی یاد مشاعروں اور قوالیوں کے طاؤس و رباب سے نہ منائی جاتی۔

اور پھر اس سے بھی تلخ تر ہے یہ حقیقت کہ اسلاف کی ہڈیاں بیچ کر کھانے والی اس قوم نے اقبال کی یاد کو بھی طلبِ منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ کراچی میں منعقد ہونے والے یوم اقبال کی شرح ٹکٹ ۵۰ر، ۲۵ر، ۱۰ر اور ۵ر روپے مقرر ہے اور ٹکٹیں زیادہ بیچنے کے لئے یہ جاذبیت بھی موجود ہے کہ

" ۲۲ اور ۲۳ اپریل کو قرعہ ڈال کر انعامی ٹکٹ نکالا جائے گا اور اس ٹکٹ کے حامل کی خدمت میں انعام پیش کیا جائے گا"

یوں آزاد پاکستان کے مرکزی مقام میں آزادی کے بعد سب سے پہلا یوم اقبال منایا جائے گا[1]۔ آنے والی نسلیں جب ان چیزوں کو دیکھیں گی تو ہمارے متعلق کیا کہیں گی۔ اس کا اندازہ ہر نگہ حقیقت آشنا[2] لگا سکتی ہے!

---

[1] چونکہ کاپیاں پریس میں جلد بھیجنی ہیں اس لئے ہم یوم اقبال کی تفاصیل پر بحث نہیں کر سکتے، ورنہ، جس تقریب کا اشتہار یہ ہے اس کی تفاصیل بھی کچھ کم "دلچسپ" نہ ہوتیں — [2] اس مضمون کا مواد جناب پرویز کے اس مضمون سے ماخوذ ہے جو اپریل سنہ ۴۷ء میں چھپا۔ اس پر کیا موقوف ہم جناب پرویز کے تدبر قرآن سے طلوع اسلام نے کیا کچھ نہیں سیکھا۔

صنم خانۂ پندار

(ہندوستان کے نظامِ نو میں مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کر دینے کے منصوبوں کے پیش نظر)

یہ باتیں ہو رہی تھیں مغبچوں کی ایک مجلس میں
کہ اب طاقِ تغافل پہ خیالِ بیش و کم رکھدیں

کریں گی ہمدلی پیدا نہ تقریریں نہ تحریریں
مناسب ہے، زبانیں بند کر لیں اور قلم رکھدیں

نہیں جب زور کا موقع تو عینِ مصلحت یہ ہے
اٹھا لیں آشتی کا جام اور تیغِ دو دم رکھدیں

ہمارے ملک میں جب ہے سبھی کچھ دین پر مبنی
تو آؤ اک عبادت گاہ کی بنیاد ہم رکھدیں

چنیں اسکی عمارت مشرق و مغرب کے ساماں سے
کہیں سنگِ عرب رکھدیں کہیں خشتِ عجم رکھدیں

اسے مرکز بنا دیں ہر جماعت ہر قبیلے کا
پرستش کیلئے سب کے خداؤں کے صنم رکھدیں

غرضمندوں کو ہاتھ آجائیگا عذرِ قدمبوسی
بتوں کے پاؤں میں سرمایۂ جاہ و حشم رکھدیں

مسلماں بت نہ پوجیں گے سو ان کے واسطے بھی ہم
صنم خانے کے اندر ایک چھوٹا سا حرم رکھدیں

کریں اس خوشنما مندر میں ایسی دلکشی پیدا
ہمارے ہو رہیں اک بار جو اس میں قدم رکھدیں

اسد کے کان تک پہنچے یہ منصوبے تو وہ بولا
جو ممکن ہے تو بیشک نور و ظلمت کو بہم رکھدیں

(جناب اسد ملتانی)

یت رکھیں گے اور ہم سمجھیں گے کہ ان کی افادیت ہمہ گیر ہے، انھیں طلوع اسلام میں شائع
ئے گا اور خود قارئین طلوع اسلام سے درخواست کی جائے گی کہ وہ مسئلہ پیش نظر میں اپنے
ت سے مستفید کریں تاکہ اس طرح اہلِ بزمِ طلوعِ اسلام میں ایک معنوی رابطہ
ہائے کہ "تواصوا بالحق والصبر" (ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کرنے) کی
و گئی ہے۔ امید ہے کہ طلوع اسلام کی برادری اس کوشش کو مفید اور دلچسپ پائیگی

طلوع اسلام کے پہلے پرچہ کو دیکھکر ایک صاحب نے طلوع اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر
د تہنیت پیش کرنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

اتی دہر کے عنوان کے ماتحت آپ نے "استقامت" کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے،
پ نے قوم کے ایک بہت بڑے مرض کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری
بتلا ہو چکی ہے۔ بیحد زود رنج، جلد باز، بات بات پر بگڑ جانے والی۔ کوئی کسی کی بات
یں کرتا۔ جوش و خروش اتنا زیادہ اور استقامت اسقدر کم۔ ایک ضرب المثل کے
ن ہماری شیر کی ہوتی ہے اور دُبچھاڑ گیدڑ کی بھی نہیں رہتی۔ تقریریں سنیئے تو ہلا کو
کے چھکے چھڑا دیں۔ لیکن اس کے بعد عمل دیکھئے تو کہیں حرکت نام کو نہیں۔ سوال یہ
سقدر شعلہ صفت کیوں ہے؟ کسی ایک دو کی بات ہو تو انفرادی طور پر اس کی تشخیص
لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ساری کی ساری قوم (جس میں مستثنیات بالکل نام کو ہیں)
یں کیوں رنگی ہوئی ہے؟ مجھے تو یہ سوال بہت گہرا اور اہم نظر آتا ہے۔ میں ایک مدت
سبب دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ
قوم اسقدر مغلوب الغضب، اسقدر شعلہ صفت، اسقدر تیز مزاج کیوں ہوتے ہیں؟ اسکے
تیز مزاجی کے ہاتھوں بگڑتے ہیں۔ کسی مسلمان دکاندار سے سودا خریدیئے تو ہر وقت اپنی پگڑی کا
معلوم یہ کب اسے اچھال دے؟ کسی کاریگر سے بات کیجئے تو ہر وقت دھڑکا رہتا ہے

کہ خدا خیر کرے، یہ کس وقت گالی دیدے۔ کسی سے معاملہ پڑجائے تو ہر وقت اندیشہ رہتا ہے کہ نجانے کس وقت بات بگڑ جائے۔ ذرا سی بات خلافِ مزاج ہوئی اور یہ آگ بگولہ ہوگئے۔ پھر نہ اپنے نقصان کی فکر ہے نہ کسی دوسرے کی عزت کا پاس۔ ہر چہ باداباد! میں پوچھتا ہوں کہ یہ پوری کی پوری قوم اس قسم کی کیوں ہوگئی ہے؟ آپ غور سے دیکھئے۔ مسلمانوں میں قدرِ مشترک یہی شعلہ مزاجی ملے گی اس میں صوبے اور خطے کی تفریق نہیں۔ بچھو کی طرح جس کی پشت پر ہاتھ پھیریئے، نیش موجود ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ اس کی علت کیا ہے؟ ڈاکٹروں سے پوچھئے تو وہ شاید کہدیں گے کہ یہ اعصابی کمزوری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اعصابی کمزوری کسی ایک فرد میں چاہیئے نہ کہ پوری قوم اس طبیعی مرض میں مبتلا ہو جائے۔ کوئی اس کی وجہ ان کی اقتصادی کمزوری بتاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ کہ ان کے دولت مندان کے غریبوں سے زیادہ شعلہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسری قوموں میں بھی ایسے ایسے غریب لوگ موجود ہیں جو ان سے بھی زیادہ غریب ہیں۔ لیکن وہاں یہ حالت ہے کہ جو زیادہ غریب ہوتا ہے، اُتنا ہی زیادہ نرم خو ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسکا اطمینان بخش جواب مجھے آج تک کہیں سے نہیں مل سکا۔ اور یہ سوال میرے دل کو ہر وقت کھٹکتا رہتا ہے کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی بہت سی ناکامیوں کا راز ان کی اس کمزوری میں ہے۔ میں شکر گذار ہونگا اگر آپ اس سوال پر پوری طرح سے روشنی ڈال کر اسکا اطمینان بخش جواب تلاش کریں۔

[سوال واقعی بڑا اہم ہے۔ ہم قارئینِ طلوعِ اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ اس بارہ میں اپنی تحقیق (بلکہ تشخیص) سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ان تمام تشخیصات کے بعد، مرض کی اصل جڑ دریافت کرلی جائے اور اس کے بعد اس کے ازالہ کی صحیح تدبیر سوچی جائے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

مدیر طلوع اسلام

اسراف

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:

"پاکستانی اچھوت" کے عنوان سے طلوع اسلام کے شمارہ بابت ماہ اپریل میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ان پر ادارہ طلوع اسلام تحسین و تشکر کا مستحق ہے۔ یہ امر موجب صد اطمینان ہے کہ طلوع اسلام جہاں اہم و دقیق مسائل کی عقدہ کشائی میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے وہاں اسکی باریک بین نگاہیں چھوٹے چھوٹے امور کو بھی جو فطرت اسلامی کے خلاف ہوں نظر انداز نہیں کرتیں۔

الحمدللہ کہ جس بورڈ کے آویزاں کئے جانے کے خلاف طلوع اسلام نے قلم اٹھایا تھا وہ اتار دیا گیا ہے۔

چند روز ہوئے رات کے وقت مجھے کونسل چیمبر اور چیف کورٹ بلڈنگ (کراچی) کے درمیانی چوک میں سے گذرنے کا اتفاق ہوا جس کے وسط میں گاندھی کا نیم برہنہ مجسمہ نصب ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس مجسمۂ سیاہ کے پاؤں میں بجلی کی دو سرچ لائٹیں (Search Lights) نصب تھیں جو اس پر روشنی ڈال کر ماحول میں ایک ناقابل بیان گھناؤنا پن پیدا کر رہی تھیں۔ اللہ اللہ! دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت۔ اور اس کے دارالسلطنت کے عین وسط میں گاندھی کے بت کی یہ عزت و تکریم! میں سناٹے میں آگیا۔ پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا۔ کیا ہمارے محبوب قائداعظم کی تصویر ہندوستان کے چوراہوں یا Public Places میں آویزاں کئے جانے کی وہاں کی حکومت یا عوام اجازت دیں گے؟ یقیناً نہیں۔ ان کے نزدیک تو ہمارے محبوب رہنما کے فوٹو کا پبلک موقعوں پر آویزاں کیا جانا تو کجا، خود رکھنا یا اس عظیم لیڈر کا عزت و تکریم سے نام لینا اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے مرادف ہے جس سے قتل لازم آئے۔ اور ہم جو بت شکنوں کی اولاد کہلاتے ہیں جنہیں تعلیم دی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے دشمنوں کی محبت کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہ دیں۔ جو ابوبکرؓ و فاروقؓ اعظم کے نقوش قدم پر چلنے کی جستجو کے بلند بانگ دعاوی کریں، اور نادم نہ ہوں کہ ہمارے زیر اہتمام ایک دشمن ملت کے مجسمے کی یہ عزت افزائی ہو رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں ارباب حکومت سے کہ اجڑے اور لٹے ہوئے غریب مسلمانوں کی گاڑھی پسینے کی کمائی گاندھی کے بت کو روشن کرنے کی ناکام کوشش پر صرف کرنا کہاں تک جائز و روا ہے۔ اگر کراچی میں برقی قوت کی ایسی ہی افراط ہے تو کیا اس کا بہترین مصرف یہ نہیں کہ پسماندہ لیاری کوارٹرز کی تاریک جھونپڑیوں میں روشنی بہم پہنچا دی جائے؟

(کیا حکومت پاکستان کا محکمہ متعلقہ بتائے گا کہ اگر انہیں اس پر اختیار نہیں کہ وہ مسٹر گاندھی کے مجسمہ کو یہاں سے الگ کر دیں تو یہ بھی کیا ضرور ہے کہ اسے سرچ لائٹ سے یوں نمایاں کیا جائے! کیا یہ برقی قوت کسی مفید کام میں صرف نہیں کی جاسکتی؟

طلوع اسلام)

جناح کیپ

تشکیل پاکستان کے بعد، محترم قائداعظم سمیت، تمام ارباب حکومت و اقتدار کی طرف سے اپیلیں ہو رہی ہیں کہ پاکستان کے محدود ذرائع پیداوار اور اس کی اقتصادی کمزوری کے پیش نظر ہر ایک کو کفایت شعاری اور سادگی کی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ بالخصوص کپڑے کے معاملہ میں بے حد کفایت کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق کپڑا مہیا نہیں کر سکتے۔

یہ اپیلیں ہو رہی ہیں اور اس کان سن کر دوسرے کان سے نکال دی جاتی ہیں لیکن کوئی عملی اقدام نظر نہیں آتا۔

سوچئے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔

ہمارے محترم قائداعظم نے، تحریک پاکستان میں بھی قوم سے بہت کچھ کہا لیکن اس کا بہت کم اثر ہوا۔ لیکن اس دس سالہ تحریک کے زمانہ میں قائداعظم نے یہ کیا کہ اپنا ہیٹ اتار کر ایک چھوٹی سی ٹوپی زیب سر فرمالی۔

اس چھوٹی سی ٹوپی میں نہ کوئی آرٹ کی جاذبیت تھی نہ کسی فیشن کی کشش۔ لیکن ہیٹ والے نے ہیٹ اتار پھینکا۔ ترکی ٹوپی والے نے ترکی ٹوپی الگ کر دی۔ طرہ بازوں نے اپنے طرہ ہائے نفک گیرا تار کر رکھ دیئے۔ اور ہر ایک نے نہایت فخر سے وہی چھوٹی سی ٹوپی سر پر رکھ لی۔

آج وہی چھوٹی سی ٹوپی، ہمارا قومی نشان اور ملی شعار بن گیا ہے۔

غور کیجئے۔ جناب قائداعظم نے بہت کچھ کہا لیکن کسی نے اس پر عمل نہ کیا۔

لیکن انہوں نے صرف ایک کام کیا اور ہر ایک نے اس کی تقلید کر لی۔

لہٰذا ظاہر ہوا کہ قوموں میں قوت عمل، وعظ و نصیحت سے نہیں، عمل کر کے دکھانے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ اگر محترم قائداعظم، پاکستان کے استحکام کے پیش نظر یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی اختیار کر لیں اور اپنے ہاں کا بنا ہوا کپڑا استعمال کریں تو یہ چیز ہزار بار کہنے سے حاصل نہ ہو گی۔ صرف ایک بار کرنے سے حاصل ہو جائے گی۔

محترم قائداعظم، آج کھدی کا بنا ہوا لباس زیب تن فرمالیں اور وہ کل ہی دیکھیں گے کہ ساری کی ساری قوم کس طرح اسی کھردرے لباس کو حریر و ابریشم سمجھ کر گلے سے لگا لیتی ہے۔

جناح کیپ ہم سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ بات کہنے سے نہیں، کرنے سے منوائی جاتی ہے۔